قیمت : -/10 روپے

ماہنامہ

اردو دنیا

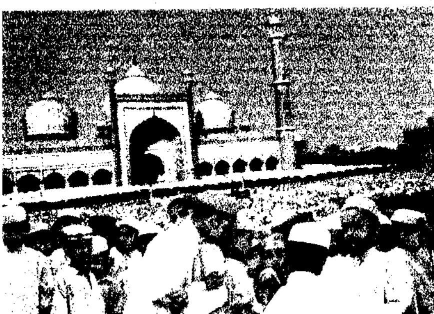

قومی اردو کونسل کا معتبر علمی جریدہ

"فکر و تحقیق"

جو ہر سہ ماہی پر دعوت فکر دینے والے تحقیقی مواد کے ساتھ منظر عام پر آتا ہے

جس میں شائع ہونے والے مضامین کا خاصہ ہے معلوم حقائق کی چھان بین اور نا معلوم حقائق کی دریافت

صرف ایک جریدہ نہیں، ماضی کے اندوختوں اور حال کے

اکتسابات سے مستقبل کو مالا مال بنانے کی ایک تحریک

خود بھی اس رسالے کے خریدار بنیں اور دوسروں کو بھی اس کی خریداری کا مشورہ دیں۔

ہندوستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ 25 روپے

سالانہ قیمت بذریعہ ڈرافٹ، منی آرڈر یا چیک NCPUL,New Delhi کے نام ارسال کریں۔

دہلی سے باہر کے حضرات چیک نہ بھیجیں۔

غیر ملکی خریداروں کے لیے

	سادہ ڈاک رجسٹرڈ	سادہ ڈاک آرڈینری	ہوائی ڈاک رجسٹرڈ	ہوائی ڈاک آرڈینری
پاکستان	184 روپے	172 روپے	316 روپے	256 روپے
نیپال	228 روپے	160 روپے	360 روپے	292 روپے
بنگلہ دیش	174 روپے	146 روپے	306 روپے	238 روپے
دیگر ممالک	220 روپے	160 روپے	396 روپے	336 روپے

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

ویسٹ بلاک: 8، ونگ: 7، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی۔ 110066

ماہنامہ

اردو دنیا نئی دہلی

جلد-8، شمارہ-11 نومبر 2006

معاون مدیر: ڈاکٹر فیروز عالم

ناشر اور طابع:
پرنسپل پبلی کیشن آفیسر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، محکمۂ ثانوی و اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند

کمپوزنگ: اسد نیاز، بہلول احمد
قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

مطبع: ایس نارائن اینڈ سنز، بی-88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا، فیز-II، نئی دہلی-110020

مقام اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

قیمت-/10 روپے، سالانہ -/100 روپے

ڈرافٹ NCPUL, New Delhi کے نام ارسال کریں۔

صدر دفتر:
ویسٹ بلاک-1، ونگ-6
آر۔کے۔پورم، نئی دہلی- 066 110
فون: 26103381, 26103938
فیکس: 26179657, 26108159
ویب سائٹ:
http://www.urducouncil.nic.in
email: ncpuleditorial@yahoo.co.in
urducoun@ndf.vsnl.net.in

شعبۂ فروخت:
ویسٹ بلاک-8، ونگ-7،
آر۔کے۔پورم، نئی دہلی-110066
فون: 26109746, 26189416

شاخ: 22-7-110 تھرڈ فلور، سالار جنگ کمپلکس،
بلاک نمبر 8-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002
فون: 040 - 24415194

اس شمارے میں

آپ کی بات 2
ہماری بات 5

روبرو
● رشید امجد سے گفتگو .... اسد فیصل 6

زبان اور تعلیم
● اچھی اردو: روزمرہ، محاورہ، صرف .... شمس الرحمٰن فاروقی 9
● ہندوستان میں اردو کی صورت حال .... روپ کرشن بھٹ 12
● بچوں کی تربیت میں اساتذہ کا کردار .... رضوان رضوی 19
● تعلیم کا مقصد محض حصول معاش نہیں .... جگدیپ ایس۔ چھوکر 21
● بہار قانون سازیہ میں اردو کی حیثیت .... زبیر احمد بھاگلپوری 23
● ان پیج — اردو پبلشنگ کی بنیادی ضرورت .... عمران لاری 25

سائنس
● کشش ثقل کیا ہے؟ .... اظہار اثر 27

معاشیات
● قابل تجدید کاری توانائی کے وسائل .... بھرت جھن جھن والا 31

خراج عقیدت
● مولانا آزاد، لسان الصدق اور فروغ اردو .... وہاب قیصر 33
● مولانا ابوالکلام آزاد کی عصری معنویت .... مشتاق احمد 37
● نجیب محفوظ .... سید احسان الرحمٰن 40
● عبدالمغنی: ایک ہمہ جہت شخصیت .... شفیع مشہدی 43
● حضرت عبدالمغنی: میرے عزیز دوست .... رضا نقوی واہی 46

ادب
● شاہ کی رکھیل (افسانہ) .... امرتا پریتم 50
● دوالی (نظم) .... نظیر اکبرآبادی 53

ہماری مطبوعات سے
● عیدگاہ ("کلیات پریم چند (جلد-14)" سے ماخوذ) .... پریم چند 54

اردو خبرنامہ .... ادارہ 60
تبصرہ و تعارف .... کتابوں پر تبصرے 71

بچوں کا گوشہ
● جانوروں کی سرکار ("بھارت کی لوک کتھائیں" سے ماخوذ) .... محمد قاسم صدیقی 77
● جواہر لال نہرو اور بچے .... افتخار الزماں 78

آپ کی بات

■ **محمد ضیاالاختر صدیقی، 34، فقیرا گنج، کٹرا، الٰہ آباد۔ 211002**

ماہ اگست کے شمارے میں مرحوم احمد ندیم قاسمی کی رحلت اور ان سے متعلق مختصر ذکر اور ان کے مشہور افسانے ''پرمیشر سنگھ'' کی اشاعت ہوئی تھی۔ اندازہ یہ تھا کہ شاید خانہ پُری کی گئی ہے لیکن ماہ ستمبر کا ''اردو دنیا'' جس میں ''گوشۂ احمد ندیم قاسمی'' کی اشاعت ہوئی ہے، دیکھ کر طبیعت خوش ہو گئی۔ آپ گوشۂ احمد ندیم قاسمی، لکھیں مگر میں اسے ''احمد ندیم قاسمی نمبر'' کہوں گا۔ مرحوم نے تو ے سال سے کچھ دن کم عمر پائی۔ 1916 کی پیدائش کے بعد پوری بیسویں صدی اور اکیسویں صدی کے بھی چھ سال یعنی اسے ''قاسمی صدی'' کہہ سکتے ہیں۔ اس شمارے میں مرحوم کے اخلاق، عادات و اطوار، ذاتیات اور ادبیات سب کچھ نہایت سلیقے سے سجایا گیا ہے۔ تمام مضامین نہایت معلوماتی ہیں اور محنت کے ساتھ قلمبند کیے گئے ہیں۔ محمد خالد اختر کا مضمون قاسمی صاحب کی شخصیت اور حالات زندگی سے پوری طرح واقف کراتا ہے۔ جناب رفعت سروش نے نہایت صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے تین صفحات کے مضمون میں وہ سب کچھ بیان کر دیا ہے جو عام قاری کے لیے نئی معلومات کے خانے میں آتا ہے۔ نند کشور وکرم صاحب کا تیار کردہ سوانحی اشاریہ اور ان کا مضمون دونوں معیاری ہیں۔ آپ نے ان کے دو افسانے ''رئیس خانہ'' اور ''بین'' شائع کیے ہیں، ان کے انتخاب کی بھی داد دینی پڑتی ہے۔ دوبارہ پڑھ کر بھی ایسا لگتا ہے کہ پہلی بار پڑھ رہا ہوں۔

جس سلیقے سے ترتیب وار مضامین شائع کیے گئے ہیں اس کے لیے ہماری طرف سے خاص طور پر مبارک باد۔

■ **شفیع ایوب، ہفت روزہ ''نئی دنیا'' ڈی۔ 21، نظام الدین ویسٹ، نئی دہلی۔ 110013**

''اردو دنیا'' زندہ باد! ستمبر 2006 کا شمارہ سامنے ہے۔ سرورق پر احمد ندیم قاسمی کی خوبصورت تصویر، سوچا صرف تصویر سے کام چلا لیا ہوگا لیکن صاحب! آپ نے تو بھرپور نمبر شائع کر دیا ہے۔ 10 جولائی 2006 کو احمد ندیم قاسمی کا انتقال ہوا اور اگست 2006 کے آخری ہفتے میں اتنا بھرپور نمبر شائع کر دینا کوئی ہنسی کھیل نہیں ہے، آپ کا انکسار ہے کہ اتنے بھرپور نمبر کو گوشۂ احمد ندیم قاسمی کہہ دیا ہے۔ میرا تعلق بھی صحافت کی دنیا سے ہے۔ اس طرح کا نمبر شائع کرنے کے لیے برسوں تیاری کی جاتی ہے۔ میں یوں ہی کسی رسالے یا فرد کی تعریف کرنے کا قائل نہیں ہوں، لیکن اتنی کم مدت میں اس قدر بھرپور نمبر شائع کر کے آپ نے ایک مثال قائم کر دی ہے۔

احمد ندیم قاسمی ایک شجر سایہ دار تھے۔ انھوں نے کئی نسلوں کی ذہنی تربیت کی ہے۔ آپ نے اردو والوں کی جانب سے بھرپور نذرانۂ عقیدت پیش کر دیا ہے۔

■ **جمیل ظہیر، ملاز 418/اے، نیو کالونی، نیو کریم گنج، گیا۔ 823001**

ستمبر کے شمارے میں گوشۂ احمد ندیم قاسمی میں جناب شمس الرحمن فاروقی، محمد خالد اختر، جمیل الدین عالی، رفعت سروش، مجتبیٰ حسین، نند کشور وکرم اور شاہد الاسلام کی شرکت اس کے اعلیٰ معیار کی دلیل ہے۔ حالانکہ کئی مضامین پرانے ہیں اور رسالوں کے حوالوں کے ساتھ آپ نے شائع کیے ہیں۔ لیکن اس موقعے کے لحاظ سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کی اشاعت کا یہی موزوں موقع اور محل ہے۔ یہ شمارہ ''شمارۂ احمد ندیم قاسمی'' کہے جانے کا مستحق ہے۔ احمد ندیم قاسمی مرحوم کا انتقال 10 جولائی 2006 کو ہوا اور آپ نے ستمبر 2006 میں گوشہ شائع کر دیا۔ اتنی کم مدت میں اتنا اہم اور پُر وقار شمارہ نکال دینا ممدوح کی عظمت اور مدح خواں کے خلوص کا بہترین اظہار ہے۔ احمد ندیم قاسمی مرحوم کی اہمیت افسانہ نگاری اور شاعری دونوں اصناف میں مساوی ہے۔ ان کی شاعری کے قدر دان ان کے افسانے ''پرمیشر سنگھ''، ''گنڈاسا''، ''الحمدللہ'' اور ''رئیس خانہ'' کا ذکر کیے بغیر نہیں رہتے۔ میرے خیال میں اس شمارے میں مرحوم کے افسانہ ''بین'' انتخاب اہم ہے۔ افسانے کے اختتام پر جب رانو کا باپ بیٹی کو مخاطب کر کے کہتا ہے کہ ''میرے اندر اتنا بہت سا درد جمع ہو گیا ہے جیسے تمھیں جنم دیتے وقت ہوا تھا۔'' تو افسانہ اپنی ہیئت کے لحاظ سے علامتی خدوخال اختیار کر لیتا ہے۔

■ **محمد ہاشم قدوائی، بی۔ سوز ڈا اپارٹمنٹ، میور وہار، نئی دہلی۔ 110091**

''اردو دنیا'' کے اکتوبر 2006 کے شمارے میں گوشۂ خورشید الاسلام بہت پسند آیا۔ کاش یہ اتنا مختصر نہ ہوتا۔ زبان اور تعلیم پر مضامین بڑے معلوماتی ہیں۔ البتہ اس شمارے میں کوئی ادبی مضمون نہ تھا۔ اگر مناسب سمجھیں تو ہر

شمارے میں اردو کے جلیل القدر صاحب طرز ادیبوں کی تحریروں کے نمونے ضرور شائع کیا کریں۔

■ **انوار انصاری، سابق سینئر آڈٹ آفیسر، اولڈ ہزاری باغ روڈ، اپوزٹ چھنا بھٹہ، شانتی نگر، ہزاری باغ۔**

ستمبر کے شمارے میں گوشۂ احمد ندیم قاسمی جو "اردو دنیا" کے 53 صفحات پر محیط ہے، بے حد پسند آیا۔ آپ نے بہت کم وقت میں اتنا عمدہ گوشہ شائع کیا ہے۔ قاسمی کی شخصیت اور فن پر جو تحریریں شامل کی گئی ہیں، ان کی انفرادیت اور اہمیت اپنی جگہ مسلّم ہے۔

گلزار صاحب کا منظوم خراج عقیدت "بابا" تو لاجواب ہے۔ ہر مصرعہ ایک نظم پر بھاری ہے۔ مجتبیٰ حسین کی تحریر میں واقعیت کے ساتھ ساتھ خلوص اور محبت بھی نمایاں ہے۔ جناب شمس الرحمٰن فاروقی، رفعت سروش اور نند کشور وکرم کی شمولیت سے گوشے کی افادیت میں اضافہ ہوا ہے۔ راشد انور راشد نے قاسمی کے ایک نمائندہ افسانے "رئیس خانہ" کا تجزیہ نہایت ہی عمدہ اور دلکش انداز میں کیا ہے۔

نجیے گوڈبولے سے گفتگو بھی بہت اہم ہے۔ ایک سوال کے جواب میں گوڈبولے صاحب یہ کہتے ہیں کہ اردو کے فروغ کا سب سے موثر ذریعہ تو اردو ذریعۂ تعلیم ہی ہے، اردو اگر اسکولوں میں پڑھائی جائے گی تو اس کی سماجی حیثیت مستحکم ہوگی۔ اس کے لیے سبھوں کو کوشش کرنی چاہیے۔

"ایس آر رنگاناتھن" (دانش غنی) "غریب انسان کامیاب سائنس داں" (عبدالودود انصاری) لائق مطالعہ مضامین ہیں۔ "کلیات حسن نعیم" اور "توبتہ النصوح" کی اشاعت کے ذریعے قومی اردو کونسل نے طالب علموں کی ایک بڑی ضرورت پوری کی ہے۔ حیدر بیابانی کی نظمیں بچوں کے لیے مفید اور کارآمد ہیں۔

■ **رضوان خاں، 96، شیخ سرائے، سیتاپور۔ 261001**

اکتوبر کے شمارے کا اداریہ آپ نے بڑے اہم موضوع پر تحریر کیا ہے۔ واقعی آج کے صارفی عہد میں تعلیم کو بھی کاروبار کی حیثیت حاصل ہوگئی ہے۔ اس مسابقتی دور میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی آرزو میں بچوں اور والدین کو زبردست تناؤ سے دوچار ہونا پڑ رہا ہے۔ وریندر پٹواری کی گفتگو بھی پسند آئی۔ گوشۂ خورشید الاسلام میں جناب شمس الرحمٰن فاروقی کا مضمون بہت اہم ہے۔ فاروقی صاحب نے خورشید الاسلام کی حیات و خدمات کا جامع جائزہ پیش کیا ہے۔ حبیب الرحمٰن چغانی کا مضمون "اردو زبان اور روزگار کے مواقع" بھی پسند آیا۔ موصوف نے ٹھیک کہا ہے کہ اگر ہمیں اپنی زبان سے محبت ہے، اگر ہم اس کی ترقی کے خواہاں ہیں تو ہمیں خود بھی کچھ کرنا ہوگا۔ "تزک جہانگیری" سے ماخوذ "حکایت بادشاہ و باغبان کی" بھی دلچسپ ہے۔ اس حکایت سے یہ نصیحت ملتی ہے کہ انسان کو اپنی نیت درست رکھنی چاہیے۔ دیگر مشمولات میں "مفاد عامہ اور حقوقِ انسانی"، "مینجمنٹ کے طلبہ کی بڑھتی اہمیت" اور "قدیم مخطوطات و مطبوعات کا تحفظ" بھی اہمیت کے حامل ہیں۔ عبدالباری مسعود کا مضمون "برطانیہ میں اردو کی صورت حال" بھی دلچسپ اور معلوماتی ہے۔

■ **محمد ناظم علی، 80-1-6، لیس نگر، نظام آباد۔ 503180**

ماہنامہ "اردو دنیا" ہر ماہ کی پہلی تاریخ کو مل جاتا ہے۔ بہت کم ماہناموں کو یہ امتیاز حاصل ہے۔ زیر نظر شمارہ اپنے مشمولات میں متنوع قسم کا مواد لیے ہوئے ہے۔ گوشۂ خورشید الاسلام پسند آیا۔ خورشید الاسلام پر جناب شمس الرحمٰن فاروقی نے جامع اور مبسوط مضمون لکھا ہے۔ زبان اور تعلیم کے تحت عبدالعلیم کا مضمون خوب ہے۔ زمانہ کے ساتھ ساتھ زبان کے مسائل بھی بدلے ہیں۔ ہندوستان میں اردو کی جڑوں کی آبیاری کرنا وقت کا تقاضا ہے۔ اردو کو معاش سے جوڑنے کے لیے اسے ٹیکنالوجی سے مربوط کرنا ہوگا۔ "اردو دنیا" قارئین کو سائنسی شعور کے ساتھ حالات حاضرہ سے بھی آگاہ کر رہا ہے۔

■ **شریف الدین خاں، نزد یونیورسٹی، سرائے پور، چھتیس گڑھ۔ 492010**

"اردو دنیا" کا شمارہ ستمبر 2006 پہلی بار دیکھا۔ یوں تو میں نے ہندوستان سے شائع ہونے والے بیشتر رسالوں کو دیکھا اور پڑھا ہے۔ لیکن "اردو دنیا" گذشتہ آٹھ سال سے شائع ہو رہا ہے اور میری نظر سے گزرا نہیں، مجھے خود حیرت اور تعجب ہے۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے اردو کی مثالی خدمت انجام دی ہے اور دے رہی ہے۔ احمد ندیم قاسمی کو ان کے شایانِ شان خراج عقیدت آپ نے پیش کیا ہے۔

■ **کاشف رضا، چندن پٹی، دربھنگہ (بہار)**

"اردو دنیا" کا شمارہ جولائی 2006 کا تازہ شمارہ موصول ہوا۔ سارے مشمولات معیاری ہیں۔ "سرسید کا بچپن" اور "اسٹیفن ہاکنگ" بہت معلوماتی مضامین ہیں۔ پروفیسر علی رفاد فتیحی سے گفتگو بھی اچھی ہے۔ خاص طور سے بچوں کی پشت پر بڑھتے بوجھ کے متعلق آپ کا اداریہ نہایت موژ دوں ہے۔

■ **محمد پرویز عالم، موہوا پوروپیرول، ضلع گوپال گنج (بہار)**

اکتوبر کے شمارے میں سرورق پر استاد بسم اللہ خاں کی تصویر دیکھ کر خوشی بھی ہوئی اور افسوس بھی ہوا کہ اتنا عظیم فنکار ہمارے بیچ سے اٹھ گیا۔ بسم اللہ خاں نے شہنائی کو جو عزت و احترام بخشا اس کے لیے ہندوستانی موسیقی کی تاریخ میں ان کا نام سنہرے حروف میں لکھا جائے گا۔ مرحوم جتنے عظیم فنکار تھے اتنے ہی عظیم انسان بھی تھے۔ تکبر اور ریاکاری سے وہ کوسوں دور تھے اور ہمیشہ انھوں نے سادگی سے اپنی زندگی بسر کی۔ انھیں امریکہ اور یورپ میں قیام کی بھی پیشکش کی گئی لیکن گنگا کے گھاٹ اور بنارس کی گلیوں سے انھیں اتنی محبت تھی کہ وہ کبھی ہندوستان چھوڑ کر کہیں اور بسنے کے لیے اپنے آپ کو آمادہ نہ کر سکے۔

گوشۂ خورشید الاسلام مجھے بے حد پسند آیا۔ خاص طور سے جناب شمس الرحمن فاروقی نے اپنے مختصر مضمون میں انھیں جس طرح سے خراج عقیدت پیش کیا ہے وہ گاگر میں ساگر کی بہترین مثال ہے۔ آپ نے خورشید الاسلام کی چند منتخب تحریریں بھی شامل اشاعت کی ہیں جن سے ان کے اسلوب و ادا کا پتہ چلتا ہے۔ ''زبان اور تعلیم'' کے تحت ڈاکٹر عبدالعلیم مرحوم کا مضمون ''ہماری قومی زبان''، حبیب الرحمن چغتائی کا مضمون ''اردو زبان اور روزگار کے مواقع'' اور عبدالباری مسعود کا مضمون ''برطانیہ میں اردو'' بے حد معلوماتی ہیں۔

بچوں کے گوشے میں آپ نے مجاہد آزادی رفیع احمد قدوائی کا تعارف پیش کیا ہے۔ اس مضمون سے مرحوم رفیع احمد قدوائی کی سادہ شخصیت اور غریبوں اور مظلوموں کے تئیں ان کے لگاؤ کا اندازہ ہوتا ہے۔ اڑیا کہانی ''بلی کا مستقبل'' کا ترجمہ شاغل ادیب نے بڑی خوش اسلوبی سے کیا ہے۔

■ **غلام حسنین باقری، تکیہ دیوان شاہ، مومن پورہ، ناگپور۔18**

''اردو دنیا'' کا اگست کا شمارہ باصرہ نواز ہوا۔ یہاں ناگپور میں ''بگ بازار'' ہے جہاں ہماری ضرورت کی ساری چیزیں ایک ہی چھت کے نیچے دستیاب ہو جاتی ہیں۔ اسی طرح ''اردو دنیا'' بھی ایک ایسا ہی بگ بازار ہے جہاں ادب، طب، صحافت، ثقافت، قانون نیز سائنسی اور معلوماتی اور مفید مضامین پر مشتمل مواد بآسانی پڑھنے کو مل جاتا ہے۔ مجموعی طور پر یہ شمارہ بہت عمدہ ہے۔ معیاری اشاعت پر مبارکباد قبول کریں۔

■ **محمد ثاقب، ہارون نگر اوّل، پھلواری شریف، پٹنہ (بہار)**

جون کے شمارے میں پروفیسر وہاب قیصر کا مضمون ''خواتین اور کمپیوٹر ٹیکنالوجی'' محفوظ رکھنے کے لائق ہے۔ اس کے ساتھ، نوشاد۔ ایک عظیم موسیقار'' اور انجم مانپوری کا ''کرائے کی ٹم ٹم'' بہت پسند آئے۔

■ **الطاف انجم، چرارشریف، کشمیر۔191112**

روبرو کے تحت غلام علی سے گفتگو پسند آئی۔ ریاض احمد نے اپنے مضمون میں ثانوی اور اعلیٰ ثانوی سطح پر تدوینِ نصاب کا کام کرتے وقت جن اہم امور کو ملحوظ خاطر رکھنے کی تجویز پیش کی ہے اور درجات میں اردو تدریس کو موثر اور معلومات افزا بنانے کے لیے جو طریقے بتائے ہیں، ان سے ان کی دقت نظر کا اندازہ ہوتا ہے۔

□□□

جدیدیت کی فلسفیانہ اساس

مصنف: شمیم حنفی

پروفیسر شمیم حنفی کی اس کتاب میں جو جدیدیت اور نئے فکری اور فلسفیانہ میلانات کے سیاق میں حوالے کی حیثیت رکھتی ہے جدیدیت اور مارکسیت سمیت ادب، زبان اور آرٹ سے تعلق رکھنے والے تمام اہم مکاتب فکر اور تصورات سے بحث کی گئی ہے۔ ادب میں قدیم و جدید کی کشمکش اور نئے طرز احساس و اظہار کے حوالے سے ایک اہم کتاب۔

صفحات: 292، قیمت: -/114 روپے

نئی شعری روایت

مصنف: شمیم حنفی

اردو میں جب جدیدیت کے رجحان نے زور پکڑا اور اس وقت کے نئے لکھنے والوں میں اسے غیر معمولی پذیرائی حاصل ہوئی تو اس کی موافقت اور مخالفت میں بہت کچھ لکھا گیا۔ پروفیسر شمیم حنفی نے موافق اور مخالف دونوں طرح کی آرا کو سامنے رکھ کر تجزیاتی مطالعہ پیش کیا ہے۔

صفحات: 239، قیمت: -/96 روپے

نوٹ: طلبہ کے لیے 45% اور اساتذہ کے لیے 40% کی خصوصی رعایت۔ تاجرانِ کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی۔ 066 110

ہماری بات

نئی دہلی میونسپل کارپوریشن نے بچوں کو بہتر تعلیم فراہم کرانے کے باب میں اساتذہ کی اہلیت کا اندازہ لگانے کے لیے ایک پیش رفت کی ہے۔ 31 اکتوبر کو دہلی کے سرکاری اسکولوں کے بیس ہزار اساتذہ اپنے اپنے مضمون کے امتحان میں شریک ہوں گے۔ یہ اساتذہ دسویں اور بارہویں جماعت کے لیے سی.بی.ایس.ای. (Central Board of School Examination) کے بنائے ہوئے پرچے حل کریں گے۔ اس امتحان میں ممتحن بھی باہر کے ہوں گے۔ دہلی سرکار کی ایجوکیشن پرنسپل سکریٹری ریناراے اور ڈائرکٹر وجے کمار بھی اس امتحان میں شریک ہوں گے۔ یہ امتحان کا پہلا مرحلہ ہے۔ دوسرے مرحلے میں معاون اساتذہ شریک ہوں گے۔

محترمہ ریناراے کے بیان کے مطابق ''اس عمل کے پس پشت ہمارا مقصد یہ معلوم کرنا ہے کہ اساتذہ جو مضمون پڑھارہے ہیں، اس کے بارے میں وہ کتنا جانتے ہیں اور کیا وہ دسویں اور بارہویں جماعت کے سی.بی.ایس.ای. امتحانات کی تیاری کرانے کے اہل ہیں؟ یہ امتحان تین گھنٹے پندرہ منٹ کا ہوگا۔ ابتدائی تین گھنٹے سی.بی.ایس.ای. کا تیار کردہ پرچہ حل کرنے کے لیے ہوں گے اور بقیہ پندرہ منٹ دہلی سرکار کے نوعمر طلبہ وطالبات کے لیے خصوصی پروگرام ''یووا'' سے متعلق سوالات کے لیے مختص ہوں گے۔ اس امتحان میں جو اساتذہ ناکام ہوں، یا اچھے نمبر نہ لاسکیں، ان کے لیے خصوصی تربیت کا انتظام کیا جائے گا۔

اس خصوصی امتحان سے قبل تمام مضامین کے اساتذہ کے لیے تین ہفتے کا تربیتی پروگرام 3 اکتوبر 2006 سے شروع کیا جارہا ہے۔ ان اساتذہ کو دہلی یونیورسٹی، جامعہ ملیہ اسلامیہ اور انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنالوجی کے ماہرین پانچ دن تک مرکوز (Intensive) تربیت دیں گے۔ اس طرح اساتذہ کو نئی معلومات حاصل ہوں گی اور تدریس کے نئے طریقے بھی سیکھنے کا موقع ملے گا۔ ایک خصوصی دستورالعمل (Manual) بھی تیار کیا گیا ہے جس میں نصاب کو مکمل پڑھانے کے عملی اور آسان طریقے بتائے گئے ہیں۔

دہلی میں دسویں اور بارہویں جماعت کے طلبہ کی تعلیم پر متعین بیس ہزار اساتذہ کا امتحان لینے اور انھیں ان کے مضمون کی تدریس کی تربیت کے لیے یہ پروگرام ایک خوش آئند اقدام ہے۔ فی الحال اس کا آغاز دہلی کے سرکاری اسکولوں کے اساتذہ سے کیا جارہا ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ تازہ کار تجربے کے نتائج کا جائزہ لینے کے بعد اس میں توسیع کر کے پورے ملک کے سرکاری اسکولوں اور نجی تعلیمی اداروں کے اساتذہ کو ان کے مضمون سے متعلق تازہ ترین معلومات فراہم کرائی جانی چاہئیں۔ سرکاری اسکولوں میں اساتذہ کے تقرر کا منضبط طریقہ ہے لیکن تعلیم کے نام پر تجارت کرنے والے نجی اداروں میں بدنظمی کی شکایت عموماً سننے میں آتی رہی ہے۔ طالب علموں سے زیادہ سے زیادہ فیس وصول کرنے اور کم سے کم تنخواہ پر کم علم اور ناتجربہ کار اساتذہ کے تقرر کی بھی شکایتیں بہت ہیں۔

یہ اچھی بات ہے کہ دہلی کی صوبائی حکومت نے اساتذہ کی تدریس کے معاملے میں سنجیدگی سے توجہ دی ہے۔ لائق اساتذہ کے تقرر اور انھیں ان کے مضمون سے متعلق متواتر نئی معلومات کی فراہمی سے تعلیمی نظام کو مزید بہتر بنایا جا سکتا ہے۔ فوج میں تو افسران کو ہر سطح پر سخت امتحان سے گزرنا پڑتا ہے اور اس میں کامیاب ہونے والے افراد ہی اعلیٰ عہدوں تک پہنچ پاتے ہیں۔ آج کے مسابقتی دور اور تیزی سے بدلتی دنیا میں اس طرح کا پیشہ ورانہ نظریہ اپنائے بغیر کسی بھی میدان میں برقرار رہنا ممکن نہیں ہے۔ ہمارے ملک کی ترقی اور خوش حالی اسی صورت میں ممکن ہے کہ تعلیم کو ہر اعتبار سے معیاری بنایا جائے۔

اساتذہ کو ایک بات ذہن نشیں رکھنی چاہیے کہ وہ امتحان میں اپنی ہتک محسوس نہ کریں بلکہ اسے ملک اور قوم کی بہتر خدمت کرنے کے لیے اپنے آپ کو تیار کرنے کا نادر موقع تصور کریں۔ اس تدریسی عمل کے دوران استاد اور طلبہ میں تعامل کے ذریعہ بھی استاد کو اپنی کمزوریوں (اپنے مضمون سے متعلق) کا پتہ چلتا ہے اور اچھے استاد کی خوبی یہ ہوتی ہے کہ وہ نہ صرف ان کمزوریوں کو دور کرتا ہے بلکہ ہر سبق کی پوری تیاری کر کے طلبہ کو پڑھاتا ہے۔

یورپ اور امریکہ کی درسگاہوں میں رواج ہے کہ طلبہ اپنے اساتذہ کی کارکردگی کی رپورٹ ادارے کے سربراہ کو دیتے ہیں۔ ہندوستان میں بھی یہ نظام رائج کرنے پر کئی بار غور کیا گیا لیکن اس پر عمل درآمد نہ ہوسکا۔ اب دہلی انتظامیہ کا قائم کیا ہوا یہ امتحان بھی استاد کی کارکردگی کا جائزہ لینے اور طلبہ سے اس کے برتاؤ اور رشتوں کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کا ایک اچھا طریقہ ہے۔

تدریس ایک مقدس پیشہ ہے اور اس کا تقدس اسی وقت تک برقرار رہ سکتا ہے جب تک اساتذہ اپنے فرائض منصبی کی انجام دہی ایمانداری، خلوص اور صدق دلی سے کریں۔ اساتذہ کا فرض ہے کہ شاگردوں کو پڑھاتے وقت نہ صرف موضوع سے متعلق تازہ ترین معلومات فراہم کرائیں بلکہ ان میں نئی نئی باتیں جاننے اور سیکھنے کا شوق بھی پیدا کریں اور صرف جماعت کے ذہین طلبہ پر ہی توجہ مرکوز نہ رکھیں بلکہ کمزور طالب علموں پر بھی توجہ دیں۔

□□□

اسد فیض

رشید امجد سے گفتگو

1960 کی دہائی میں اردو میں جدید افسانے کا ظہور ہوا۔راولپنڈی اردو دنیا میں اس اعتبار سے اہمیت رکھتا ہے کہ اس نے افسانے کی اس تبدیلی کو نہ صرف سب سے پہلے اپنایا بلکہ اس کی ترویج میں اہم کردار ادا کیا۔ اس لیے راولپنڈی کو جدید افسانے کا شہر بھی کہا جا سکتا ہے۔عصر حاضر میں بھی اس صنف کو قبولیت عام بخشنے میں اس شہر کا اہم کردار یہ ہے کہ یہاں منشا یاد سے لے کر حمید شاہد تک افسانہ لکھنے والوں کا ایک قبیلہ ہے جو اپنے رشحات قلم سے اردو افسانے کو باثروت بنا رہے ہیں اور معاصر ادب میں جن کی وجہ سے اردو افسانے کا اعتبار قائم ہے۔اس قبیلے کے ایک اہم فرد ڈاکٹر رشید امجد ہیں جنہیں اردو افسانے میں اہم مقام حاصل ہے۔انہوں نے افسانے بھی لکھے ہیں اور جدید افسانے کی تعبیر و تفہیم میں اہم کردار بھی ادا کیا ہے۔وہ 1960 سے افسانے لکھ رہے ہیں۔ان کا پہلا افسانہ بہ عنوان ''سنگم'' ''ادب لطیف'' لاہور میں شائع ہوا۔ اب تک ان کے گیارہ افسانوی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ڈاکٹر رشید امجد نے افسانے کے علاوہ تنقید اور تحقیق کے حوالے سے بھی متعدد کتب تصنیف کی ہیں۔ان کی تصنیفات و تالیفات کی کل تعداد ستائیس ہے۔''بیزار آدم کے بیٹے'' (1974)، ''ریت پر گرفت''(1978)، ''سہ پہر کی خزاں''(1980)، ''پت جھڑ میں خود کلامی'' (1984)، ''بھاگے ہے بیاباں مجھ سے''(1988)، ''دشت نظر سے آگے''(کلیات)(1991)، ''دشت خواب'' (1993)، ''کاغذ کی فصیل'' (1993)، ''عکس بے خیال (1993)، ''گمشدہ آواز کی دستک'' (1996)اور ''ست رنگے پرندے کے تعاقب میں'' (2000) آپ کے افسانوی مجموعے ہیں۔

''نیا ادب'' (1969)،''رویے اور شناختیں'' (1988)، ''یافت اور دریافت'' (1989)، ''شاعری کی سیاسی و فکری روایت'' (1993) اور ''میراجی: شخصیت و فن'' (1995) تنقیدی کتب اور ''پاکستانی ادب'' (1980-1984) (چھ جلدیں) ''اقبال: فکر و فن'' (1984)،''تعلیم کی نظریاتی اساس'' (1984)، ''میرزا ادیب: شخصیت و فن'' (1991)، ''پاکستانی ادب۔ نثر'' (1990, 1991, 1994, 2001)، ''مزاحمتی ادب'' (1995) اور ''پاکستانی ثقافت'' (1999) آپ کی مرتب کردہ کتابیں ہیں۔

2001 میں آپ کی خود نوشت ''تمنا بے تاب'' کے نام سے طبع ہوئی ہے جو اپنے اندر تخلیقی ذائقہ رکھتی ہے اورجو اپنے عہد کا سیدھا اور سچا اظہار بھی ہے۔

ڈاکٹر رشید امجد کی ادبی زندگی کے بارے میں ایک مکالمہ قارئین ''اردو دنیا'' کی نذر ہے۔

سوال: آپ کب اور کہاں پیدا ہوئے؟

جواب: میرا تعلق سری نگر سے ہے اور میں وہاں 5 مارچ 1940 کو پیدا ہوا۔

سوال: آپ نے ابتدائی تعلیم کہاں سے حاصل کی؟

جواب: میں پہلی ایک دو جماعتوں تک سری نگر میں زیر تعلیم رہا، اس کے بعد 1947 میں والدین کے ساتھ پاکستان آ گیا اور ہم نے راولپنڈی میں سکونت اختیار کر لی۔ میری بعد کی تعلیم یہیں پر مکمل ہوئی۔ میں ابتدائی جماعتوں میں اپنے محلے کے ایک اسکول پاکستان گرلز ہائی اسکول میں پڑھتا رہا۔ ساتویں جماعت تک وہاں رہا۔ اس کے بعد ڈینیز ہائی اسکول میں داخلہ ہو گیا۔ یہ اس زمانے میں ایک معیاری اسکول کے حوالے سے شہرت رکھتا تھا۔ وہاں سے میٹرک کیا، پھر گورنمنٹ کالج اصغر مال میں داخلہ لے لیا۔ لیکن سلسلۂ تعلیم کچھ عرصہ بعد منقطع ہو گیا اور مجھے ملازمت کرنا پڑ گئی کیوں کہ گھر کے حالات دگرگوں تھے۔ بقیہ تعلیم میں نے بی.اے. تک پرائیویٹ حاصل کی۔ ایم. اے. اردو میں نے گورڈن کالج راولپنڈی سے کیا۔ 1990 میں پی ایچ. ڈی.(اردو) میں نے اپنی ملازمت کے دوران کیا۔ میرے تحقیقی مقالے کا عنوان ''میراجی: فن و شخصیت'' تھا۔

سوال: آپ کو ادیب بننے کا خیال کیسے آیا؟

جواب: ادب سے میری ایک شناسائی تو یوں تھی کہ میرے والد شاعر تھے۔ وہ کشمیری، پنجابی، اور فارسی میں شعر کہتے تھے۔ اس وجہ سے گھر میں ایک ماحول موجود تھا لیکن مجھے اس زمانے میں کبھی خود لکھنے کا خیال پیدا نہیں ہوا۔ ہوا یہ کہ جب ایف. اے. میں اپنی تعلیم ادھوری چھوڑ کر میں نے ملازمت (بطور کلرک) شروع کی تو اسی شعبے میں ایک

اور دوست بھی ادب کا ذوق رکھتے تھے۔ یہ افسانہ نگار اعجاز راہی تھے۔ہم وہاں خالی وقت میں کتابیں پڑھتے رہتے تھے۔ وہیں ہم دونوں میں کتابوں کا تبادلہ بھی ہوتا تھا۔وہ اس زمانے میں افسانے لکھتے تھے۔انھوں نے ایک دن مجھ سے کہا' کہ میں نے ایک افسانہ لکھا ہے، آپ وہ سنیں۔میں نے افسانہ سن کر انھیں کہا کہ یار ایسا افسانہ تو میں بھی لکھ سکتا ہوں۔تو انھوں نے کہا کہ لکھیے۔ان کے اصرار پر میں نے ایک کہانی لکھی تو انھوں نے اسے سراہا۔یہ میں نے ایک فلمی پرچے کو اشاعت کے لیے بھیج دی اور وہ اس میں چھپ گئی۔اس کے بعد میری چند اور تحریریں بھی فلمی پرچوں میں چھپیں۔ یہ میری نومشقی کا زمانہ تھا۔

سوال: آپ کا پہلا افسانہ کب اور کس جریدے میں شائع ہوا؟

جواب: ابتدائی تحریروں کی اشاعت کے بعد اعجاز راہی مجھے راولپنڈی کے ادبی حلقوں میں ساتھ لے جانے لگے۔اس زمانے میں راولپنڈی میں ادیبوں کا ایک حلقہ'' بزم میر'' کے تحت ہفتہ وار اجلاس منعقد کرتا تھا۔میں اس میں جانے لگا۔اس کے ایک اجلاس میں میں نے بھی ایک افسانہ سنایا۔وہاں ایک سینیر ادیب غلام رسول طارق بھی تھے۔ اجلاس کے اختتام پر وہ مجھے ایک جانب لے گئے اور کہنے لگے، یہ کہانی تم نے خود لکھی ہے یا کسی سے لکھوائی ہے۔میں نے انھیں بتایا کہ یہ میں نے خود لکھی ہے۔وہ کہنے لگے،تم اچھا افسانہ لکھ سکتے ہو لیکن تمھاری تربیت کی ضرورت ہے۔میں نے انھیں کہا کہ میں اس سلسلے میں کیا کروں۔ انھوں نے کہا کہ جب اگلی کہانی لکھو تو میرے پاس لانا۔میں ایک اور کہانی لکھ کر ان کے پاس لے گیا۔ اس پر انھوں نے مجھے بہت سے مشورے دیے۔اس زمانے میں میں اپنا نام اختر رشید ناز لکھتا تھا اور اسی نام سے فلمی پرچوں میں میری چند کہانیاں چھپی تھیں۔چند دوستوں کے ساتھ مشورے سے میں نے اپنا نام اختر رشید سے رشید امجد کرلیا۔ میرا پہلا افسانہ'' ادب لطیف''لاہور میں ''سنگم''کے نام سے ستمبر 1960 کے شمارے میں شائع ہوا۔اس زمانے میں میرزا ادیب ''ادب لطیف'' کے مدیر تھے۔اس کے بعد میں مسلسل کہانیاں لکھتا رہا۔استاد غلام رسول طارق کمال کے آدمی تھے۔بنیادی طور پر وہ مشرقی تنقید اور مزاج کے فرد تھے۔لفظ کی اہمیت اور اس کے استعمال پر ان کو بے حد دسترس تھی۔چنانچہ جب بھی میں انھیں کہانی لکھ کر دکھاتا تو وہ لے کر اسے پھاڑ دیتے تھے،اس کے بعد کہتے تھے اب اس کہانی کو دوبارہ لکھیے لیکن درمیان سے اس کا آغاز کیجیے، پھر کہتے تھے اب اختتام سے اس کا آغاز کیجیے۔ اس طرح ایک ہی کہانی کو کئی مرتبہ لکھواتے تھے۔کئی مرتبہ تو میں زچ ہو جایا کرتا تھا لیکن میری اس مشق نے بعد میں مجھے بہت فائدہ پہنچایا۔

سوال: آپ کے خیال میں کیا ادب لکھنا کل وقتی کام ہے؟

جواب: میرے خیال میں ادب لکھنا کل وقتی کام ہے لیکن بدقسمتی سے ہمارے یہاں ایسا نہیں ہے۔ اس وجہ سے ہمارے ادب کو کئی نقصانات پہنچے ہیں۔مثلاً ہمارے یہاں ناول کم لکھا گیا ہے۔ ناول کے لیے جس منصوبہ بندی اور وقت کی ضرورت ہوتی ہے وہ ہمارے ادیبوں کے پاس نہیں۔ زیادہ تر ادبا کوئی ملازمت کرتے ہیں اور بقیہ وقت میں ادب تخلیق کرتے ہیں۔ ادب ان کا ایک مشغلہ ہے۔چنانچہ ادب کے لیے جس قدر سنجیدگی اور ریاضت کی ضرورت ہوتی ہے، وہ میسر نہیں ۔ کچھ اور عوامل بھی ہیں جن کے سبب ادب کل وقتی پیشہ نہیں بن پایا۔مثلاً ادبی رسائل کے مالکان کاغذ، پرنٹنگ پریس اور کاتب کے پیسے تو فوراً ادا کردیتے ہیں لیکن ان میں ادیب ہی ایسا مظلوم فرد ہے جسے وہ پیسے کیا، رسالہ بھی مفت دینے کے روادار نہیں ہوتے۔اب ادیب کا کیا قصور ہے کہ وہ اکیلا ادب کے لیے قربانی دے۔اس کے علاوہ معاشرے میں کتب بینی کی عادت بھی روبہ زوال ہے۔

سوال: آپ کا شمار جدید اردو افسانہ لکھنے والے اولین افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔کیا اب جدید افسانہ دم توڑ گیا ہے؟

جواب: نہیں یہ بات نہیں ہے،بات یہ ہے کہ 1960 کی دہائی میں جو جدید افسانہ ہم نے شروع کیا تھا، اب اس میں ایک ٹھہراؤ آگیا ہے۔ ابتدا میں جدید افسانے کا جو قاری تھا اس کی تربیت ابتدا سے کلاسیکی افسانے نے کی تھی۔جب نیا افسانہ لکھا جانے لگا تو ابتدا میں اسے قبول نہیں کیا گیا۔اب صورت حال یہ ہے کہ نئے افسانے کے حوالے سے قاری کی تربیت ہوگئی ہے اور لکھنے والوں کے ہاں بھی نفاست اور مہارت آگئی ہے۔اب جدید افسانہ قاری کو اجنبی نہیں لگتا اور اس میں ابہام بھی نہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ کہانی کے بغیر فکشن کا تصور ہی نہیں ہے۔فرق صرف یہ ہے کہ کہانی کیا ہوتی ہے۔کیا کہانی واقعات کا ایک تسلسل ہے یا خیال کا ایک تسلسل بھی کہانی ہوسکتی ہے۔کہانی تو بہرطور جدید افسانے میں موجود ہوتی ہے اس لیے کہ افسانہ کہانی کے بغیر لکھا ہی نہیں جا سکتا۔ لیکن کہانی کا concept کیا ہے۔ میرے خیال میں کہانی کی بنیاد ایک وقوعہ ہے اور ہمارے پرانے افسانے میں وقوعہ کا تسلسل واقعات کی شکل اختیار کرتا ہے۔ اب کہیں کہیں یہ بھی ہوتا ہے کہ وقوعے سے ابھرنے والا خیال بھی کہانی کی بنیاد بنتا

ہے۔ اس لیے کہ بنیاد تو وقوعہ ہے، اس سے ہم نہیں نکل سکتے۔ اس لیے کہانی پن تو موجود ہے۔ اب کچھ وقت گزرنے کے بعد ہم اس کے عادی ہو گئے ہیں۔ جس طرح ابتدا میں ہر نیا فیشن اجنبی ہوتا ہے لیکن جب ہم عادی ہو جاتے ہیں تو سب اس کو اپنا لیتے ہیں، کچھ ایسا ہی معاملہ جدید اردو افسانے کا بھی ہے۔ اس لیے کہ ہر جدت ایک عرصے کے بعد روایت کا حصہ بن جاتی ہے۔

سوال: ہمارے یہاں جو تنقید لکھی جا رہی ہے۔ کیا آپ اس کے معیار سے مطمئن ہیں؟

جواب: تنقید کا معاملہ ہمارے یہاں ہمیشہ متنازعہ فیہ رہا ہے اس لیے کہ من حیث القوم ہمارا مزاج تنقیدی نہیں ہے اور ہم تنقید کو برداشت ہی نہیں کرتے ہیں۔ ملوکیت کے تحت ہماری جو تربیت ہوئی ہے اس میں تنقید کی گنجائش ہی نہیں۔ ہمارے یہاں تنقیدی نظریات بھی باہر سے آئے ہیں اور ایسی تنقید جو ہماری روایات اور ادب کے اندر سے جنم لے، اس کا فقدان ہے۔ ہونا یہ چاہیے کہ اردو میں لکھے جانے والے ادب سے ہی تنقیدی پیمانے اخذ کر کے ان کی روشنی میں فن پارے کو جانچا جائے۔

سوال: 2001 میں آپ کی خودنوشت ''تمنا بے تاب'' شائع ہوئی۔ اس کو لکھنے کا آپ کو خیال کیسے آیا؟

جواب: میں ایک ناول لکھنا چاہتا تھا اور میرے اپنے حالات میں بھی اس قدر اتار چڑھاؤ تھا کہ سوانحی ناول کی صورت بنتی تھی۔ اس ارادے سے میں نے اسے شروع کیا تھا لیکن دو بار لکھنے کے بعد اس میں کچھ ایسی ثقیل چیزیں آتی گئیں کہ ناول کا خیال میرے ذہن سے نکل گیا اور میں نے فیصلہ کیا کہ میں اس نظام کو بدلنے کے لیے تو عملی طور پر کچھ نہیں کر سکتا، اگر میں یہ سچائی کے ساتھ اپنی خودنوشت میں رقم کر دوں جس سے ہماری نسل کو واسطہ پڑا تو ممکن ہے کبھی کسی طور بہتری کی کوئی صورت نکل آئے، اس لیے کہ بہ حیثیت ادیب یہ میرا فرض بنتا ہے۔ اس لیے میں نے جو واقعات دیکھے یا جن سے میں گزرا ان کو میں ''تمنا بے تاب'' میں ضبط تحریر میں لے آیا۔

سوال: آج کل آپ کن ادبی منصوبوں پر کام کر رہے ہیں؟

جواب: میں آج کل ویسے تو افسانے لکھتا رہتا ہوں لیکن ایک تنقیدی کتاب لکھنے کا ارادہ ہے جس میں پاکستانی ادب کے پچاس سال کا جائزہ قلم بند کیا جائے۔ اس کے کچھ مضامین تو ادبی جرائد میں چھپ چکے ہیں مثلاً پاکستانی ادب کے بنیادی رجحانات، پاکستانی غزل کے پچاس سال، ابھی نظم اور افسانے کے حوالے سے کچھ کام باقی ہے۔

□□□

رابطہ:
Ham Asr
GPO, Box No. 27
Rawalpindi (Pakistan)

مجموعہ نغز

مصنف: قدرت اللہ قاسم

حکیم ابوالقاسم میر قدرت اللہ المتخلص بہ قاسم کا لکھا ہوا شعرائے اردو کا یہ مشہور تذکرہ، دو جلدوں میں تھا جسے فاضل مرتب پروفیسر محمود شیرانی نے یکجا کر دیا ہے۔ پروفیسر شیرانی کا خیال ہے کہ محمد حسین آزاد کی مشہور تالیف آب حیات کا ایک اہم ماخذ یہ تذکرہ بھی ہے جس کا قلمی نسخہ انھیں آزاد کے ذخیرۂ کتب سے دستیاب ہوا۔

دوسرا ایڈیشن: صفحات: 492، قیمت -/268 روپے

عربی ادب کی تاریخ (تین جلدوں میں)

مصنف: ڈاکٹر عبدالحلیم ندوی

مدارس کے علاوہ ہندوستان کی مختلف یونیورسٹیوں میں عربی زبان و ادب کی تعلیم دی جاتی ہے۔ لیکن اب تک اردو میں کوئی ایسی کتاب دستیاب نہیں تھی جس میں عربی ادب کی جامع اور مبسوط تاریخ بیان کی گئی ہو۔ ڈاکٹر عبدالحلیم ندوی کی یہ کتاب اس کمی کو پورا کرتی ہے۔ کتاب کی پہلی جلد میں زمانۂ جاہلیت، دوسری جلد میں حضرت محمدؐ کے عہد سے خلفائے راشدین کے عہد نیز اموی دور اور تیسری جلد میں عباسی دور کا احاطہ کیا گیا ہے۔

صفحات: جلد اول: 352، جلد دوم: 390، جلد سوم: زیر طبع
قیمت: جلد اول: 86 روپے، جلد دوم: 91 روپے

نوٹ: طلبہ کے لیے 45% اور اساتذہ کے لیے 40% کی خصوصی رعایت۔ تاجرانِ کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر. کے. پورم، نئی دہلی-110066

شمس الرحمٰن فاروقی

اچھی اردو: روزمرہ، محاورہ، صرف

اس شمارے سے ہم "اردو روزمرہ" کے عنوان سے ایک نیا کالم شروع کر رہے ہیں جس میں اردوروزمرہ اور اردو زبان کے بارے میں قارئین کے سوالات کا جواب دیا جائے گا۔ شرط یہ ہے کہ ایک وقت میں تین سے زیادہ سوالات نہ پوچھے جائیں اور سوالات کا تعلق الفاظ کے استعمال، روزمرہ میں ان کا صرف اور ان کے معنی کے بارے میں ہو۔

(ادارہ)

سوال: لفظ 'کافی' کا محل استعمال کیا ہے؟

جواب: 'کافی' کے معنی ہیں، 'جو کفایت کرے، کام نکل جانے کے قابل، یعنی 'جو ضرورت کے لیے مناسب ہو'۔ لہٰذا اس لفظ میں ضرورت کا مفہوم ہمیشہ موجود رہتا ہے۔ آج کل بعض لوگ 'کافی' کو 'بہت' یا 'زیادہ' کے معنی میں بولنے لگے ہیں۔ یہ غلط تو ہے ہی، مضحکہ خیز بھی ہے۔ مثلاً:

حادثے میں کافی آدمی مرے۔ [یعنی جتنے لوگوں کے مرنے کی ضرورت تھی اتنے ہی مرے۔]

ان کی طبیعت کافی خراب ہے۔ [یعنی جتنی خراب ہونا چاہیے اتنی خراب ہے۔]

میں کافی دیر سے انتظار میں ہوں۔ [یعنی اتنی دیر سے جو ضرورت بھر ہے۔]

ظاہر ہے کہ مندرجہ بالا جملوں میں 'کافی' کو غلط اور اُضحوکہ طور پر استعمال کر دیا گیا ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ یہ استعمال غلط ہو تو ہو، لیکن اب 'کافی' اُسی معنی میں بولا جا رہا ہے، تو اس کے دو جواب ہیں۔ (1) ایک تو یہ کہ ابھی 'کافی' کو 'زیادہ' کے معنی میں بولنے والے بہت نہیں ہیں (یا یوں کہیں کہ 'کافی' نہیں ہیں)۔ لہٰذا 'کافی' بمعنی 'زیادہ' ابھی قائم نہیں ہوا ہے۔ (2) دوسرا جواب یہ ہے کہ اگر 'کافی' کو 'بہت' یا 'زیادہ' کے معنی میں بولیں تو اس کے اصل معنی (ضرورت بھر، جو کفایت کرے) کے لیے ہمارے پاس کوئی لفظ نہ رہے گا۔ لہٰذا غلط معنی پر اصرار کرنا اور ایک صحیح اور ضروری معنی سے ہاتھ دھو لینا عقلمندی کی بات نہیں۔

'کافی' کے حسب ذیل استعمال بالکل درست ہیں:

مجھے بھوک زیادہ نہیں ہے، ایک پیالہ دودھ ہی کافی ہوگا۔

بس اتنا کہنا کافی ہے کہ یاد کرتے ہیں۔

اللہ نے تمھیں عقل دی، اعضاے سالم دیے۔ کیا اتنا کرم کافی نہیں؟

کافی ہے تسلی کے لیے گز کا ملیدہ۔

بچوں کا کیا ہے، انھیں خوش کرنے کے لیے ایک کھلونا ہی کافی ہے۔

ملحوظ رہے کہ اگر 'کافی وافی' بولا جائے تو 'بخوبی'، 'بھرپور' کے معنی نکلیں گے اور ان معنی کو کبھی کبھی 'زیادہ' یا 'بہت' کے برابر فرض کر سکتے ہیں۔ لیکن اکیلا 'کافی' کبھی کبھی زیادہ/ بہت کے معنی میں نہیں بولا جائے گا۔

سوال: ناول، کلاس، سگریٹ وغیرہ انگریزی الفاظ کی جنس متعین کرنے کا کیا طریقہ ہے؟

جواب: غیر زبان کے الفاظ کی جنس عام طور پر یوں طے کرتے ہیں کہ اپنی زبان میں اس لفظ کے متبادل لفظ کی جو جنس ہوتی ہے اسے ہی غیر زبان کے لفظ پر جاری کر دیتے ہیں۔ مثلاً:

آنکھ، مونث؛ چشم، مونث

باد، مونث؛ ہوا، مونث

پریت، پیت، مونث؛ محبت، مونث

پریم، موہ، مذکر؛ عشق، مذکر

پوتھی، مونث؛ کتاب، مونث

پتہ، مذکر؛ برگ، مذکر

پھول، مذکر؛ گل، مذکر

دھیان، مذکر؛ خیال، مذکر

ٹونا، مذکر؛ جادو، سحر، مذکر

ڈر، مذکر؛ خوف، مذکر

گھر، مذکر؛ مکان، مذکر

گیان، مذکر؛ علم، مذکر

لاج، مونث؛ شرم، مونث

انگریزی الفاظ کی بھی یہی صورت ہے۔ مثلاً:

گاڑی، مونث؛ ٹرین، مونث

وقت، مذکر؛ ٹائم، مذکر

وغیرہ۔ کبھی کبھی اس کے خلاف بھی ہوتا ہے، لیکن عمومی اصول کے طور پر یہ صحیح ہے۔ مشکل یہ ہے کہ ہماری زبان میں انگریزی کے زیادہ تر لفظ اتنے پرانے نہیں ہوئے ہیں کہ ان سب کی جنس پر سب کا اتفاق ہو جائے۔ لیکن آہستہ آہستہ اتفاق ہو بھی رہا ہے۔ مثلاً Car اور Motor کو پہلے مذکر مونث دونوں بولتے تھے۔ لیکن اب Car بالاتفاق مونث ہے۔ اور Motor اگر 'کار' کے معنی میں ہے تو مونث ہے اور کسی چیز کو چلانے والی مشینی چیز کے معنی میں ہے، تو مذکر ہے۔ لیکن کئی الفاظ کے بارے میں ابھی اتفاق نہیں ہے۔ ناول، کلاس، سگریٹ، ایسے ہی الفاظ ہیں۔ ان تینوں کو لوگ الگ الگ طرح بولتے ہیں۔ بہرحال، تجربے کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ اس وقت اکثر لوگ انھیں حسب ذیل طور سے بولتے ہیں:

ناول، مذکر۔ (مونث بھی سننے میں آتا ہے، خاص کر جنوب اور بہار میں، لیکن بہت کم۔)

کلاس، مذکر، مونث۔ (یعنی اسے دونوں طرح بولا جاتا ہے۔ کبھی کبھی ایک ہی شخص اسے مذکر بولے گا اور پھر کسی اور موقعے پر اسے مونث بول دے گا۔ اگر بہت چھان بین کی جائے تو کلاس کو مذکر کہنے والے شاید کچھ اکثریت میں ہوں گے۔)

سگریٹ مونث، مذکر۔ (لیکن اکثریت مونث بولنے والوں کی ہے۔)

سوال: 'اور' اور 'و' کا محل استعمال کیا ہے؟

جواب: یہ دونوں لفظ عاطف ہیں، یعنی دو یا زیادہ الفاظ کو جوڑنے کے کام آتے ہیں۔ اصولی طور پر کسی بھی دو یا دو سے زیادہ لفظوں کو جوڑنے کے لیے ہمیں آزادی ہونی چاہیے تھی کہ 'اور' لکھیں یا 'و' لکھیں۔ لیکن کئی وجوہ کی بنا پر رواج عام حسب ذیل قاعدوں کی پابندی کرتا ہے۔

(1) اگر ایک لفظ دیسی یا انگریزی اور ایک لفظ فارسی/عربی/ترکی ہے تو انھیں جوڑنے کے لیے 'و' کا استعمال درست نہیں۔ مثلاً حسب ذیل استعمالات غلط ہیں:

اسٹیشن و دوکان؛ بازار و گلی؛ پانی و شراب؛ چڑیا و شیر؛ شام و رات؛ کتاب و کاپی؛ مکان و گھر، وغیرہ۔

ان سب میں جوڑنے کی علامت 'و' نہیں بلکہ 'اور' استعمال ہونا چاہیے۔

(2) عربی، فارسی، ترکی الفاظ کے مابین 'و' لگانا ٹھیک ہے۔ مثلاً:

آب و دانہ؛ آرزو و ارمان؛ خواب و خیال؛ رنگ و نسل؛ شام و سحر؛ مہربانی و محبت؛ نقش و تاثر؛ موت و حیات وغیرہ۔

(3) دیسی الفاظ کے مابین یا انگریزی/فرانسیسی وغیرہ مغربی زبانوں کے الفاظ کے مابین 'و' نہیں لگانا چاہیے۔

مثلاً حسب ذیل استعمالات غلط ہیں:

بلی و کتا؛ بندوق و کارتوس؛ پانی و بجلی؛ روٹی و کپڑا؛ کلاس و کالج؛ مٹی و پودا وغیرہ۔

(4) عربی/فارسی/ترکی لفظ کی جمع اردو قاعدے سے بنی ہو تو ایسے لفظ اور کسی عربی/فارسی/ترکی/اردو لفظ کے درمیان 'واو' نہیں لگانا چاہیے اور نہ ایسے لفظوں ہی کو جوڑنے کے لیے 'واو' لانا چاہیے۔ مثلاً حسب ذیل استعمالات غلط ہیں:

آسمانوں و ہواؤں؛ بلبلوں و چیلوں؛ پردے و بستر؛ دوائیں و شیشی؛ شمعیں و شامیں؛ کتابیں و کاغذ؛ نظمیں و قصائد؛ یاقوت و موتی وغیرہ۔

مندرجہ بالا اصول دو یا دو سے زیادہ الفاظ کے جوڑ کے لیے 'واو' کے استعمال پر جاری کیے جاتے ہیں۔ لہٰذا حسب ذیل طرح کے بھی استعمالات غلط ہیں:

آنکھوں و ہاتھوں و دل؛ انسانی و سماجی و سائنسی علوم؛ ہندوستانی و دیگر اقوام؛ خیالوں و خوابوں و تصورات کی دنیا؛ سیاسی و اسکولی و پہاڑی نقشے؛ کتابوں و تصویروں و دستاویزوں کی مدد سے؛ مذہبی و سائنسی و دیہاتی لوگ وغیرہ۔

ملحوظ رہے کہ اشخاص، جگہوں، کتابوں وغیرہ کے ناموں کے مابین 'واو'

لگانا بالکل درست ہے۔ مثلاً حسب ذیل استعمالات بالکل ٹھیک ہیں:
بوطیقا و رامائن؛ حامد و رمیش؛ شیکسپیئر و غالب؛ کوفہ و بغداد؛ لندن و پیرس؛ نہرو و گاندھی وغیرہ۔

سوال: برائے کرم اور براہ کرم میں کون سا فقرہ صحیح ہے؟

جواب: دونوں صحیح ہیں۔ اگر چہ لغات میں "براہ کرم" درج نہیں لیکن یہ پڑھے لکھے لوگوں کی زبان پر مدت سے ہے۔ اسی طرح، حسب ذیل بھی صحیح ہیں، اگر چہ لغات میں نہیں ملتے:

براہ خدا؛ براہ مروت؛ براہ مہربانی؛ براہ نوازش۔

یعنی مندرجہ بالا فقروں میں 'برائے' لکھیں یا 'براہ' لکھیں، دونوں صحیح ہیں۔ لیکن ملحوظ رہے کہ حسب ذیل فقروں میں صرف 'برائے' ہے، ان میں 'برائے' کو 'براہ' سے نہیں بدل سکتے:

برائے اصلاح؛ برائے بیت؛ برائے تسلی؛ برائے چندے؛ برائے نام۔

سوال: 'برائے' میں ہمزہ لگانا چاہیے یا نہیں؟

جواب: 'برائے' فارسی کا مستقل لفظ ہے، لیکن یہ تنہا کبھی نہیں آتا۔ فارسی میں اس کے معنی ہیں، 'واسطے، لیے'۔ اردو میں بھی یہی معنی ہیں اور اردو میں بھی یہ تنہا کبھی نہیں آتا۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ فارسی میں اس کا املا مع ہمزہ تھا یا بدون ہمزہ، کیونکہ پرانے لغات میں یہ لفظ درج نہیں۔ اور اگر ہوتا بھی تو املا کی تحقیق ہو جانا ضروری نہ تھا کیونکہ ممکن ہے کاتب نے غلطی کر دی ہو۔ بہر حال، "فرہنگ آنندراج" مطبوعہ ایران میں اس کا املا 'برای' یعنی بدون ہمزہ لکھا ہوا ہے۔ جیم کی فارسی انگریزی ڈکشنری میں بھی یہی املا ہے۔ اردو میں شیکسپیئر، آصفیہ، نور اور ترقی اردو بورڈ کراچی کی اردو لغت، ان سب میں مع ہمزہ (یعنی 'برائے') درج ہے۔ پلیٹس میں بدون ہمزہ (یعنی 'برای') لکھا ہوا ہے۔ موجودہ زمانے میں 'برائے' بدون ہمزہ لکھنے کا رجحان بڑھ رہا ہے اور میں خود بے ہمزہ 'برائے' لکھتا ہوں۔ لیکن مع ہمزہ ('برائے') بھی بالکل درست ہے۔

سوال: 'رہائش' اور 'قیام' میں کون سا لفظ صحیح ہے؟

جواب: میں 'رہائش' کو صحیح نہیں سمجھتا، اگر چہ اب اسے جس کثرت سے استعمال کیا جا رہا ہے اسے دیکھتے ہوئے کچھ مدت کے بعد اسے صحیح ماننا پڑ جائے گا۔ میں نے کسی ثقہ بزرگ، مثلاً مسعود حسن رضوی ادیب، آل احمد سرور، سید احتشام حسین کو 'رہائش' بولتے نہیں سنا، لکھنا تو بڑی بات ہے۔

فارسی کا قاعدہ ہے کہ مصدر سے مضارع بناتے ہیں اور پھر مضارع کے آخری حرف یعنی دال، کو حذف کر کے اس پر 'شین' مع کسرہ بڑھا دیتے ہیں۔ اس طرح جو اسم حاصل ہوتا ہے اسے حاصل مصدر کہتے ہیں۔ مثلاً:

مصدر، آراستن؛ مضارع، آراید؛ حاصل مصدر ('دال' کو حذف کر کے اور اس پر 'شین' بڑھا کر)
آرایش/آرائش

مصدر، خواستن؛ مضارع، خواہد؛ حاصل مصدر، خواہش

مصدر، رفتن، مضارع، رود؛ حاصل مصدر، روش

اردو میں حاصل مصدر بنانے کا کوئی قاعدہ نہیں ہے لیکن ہم لوگوں نے بعض فارسی اردو مصدروں کے حاصل مصدر فارسی کے طرز پر خود بنا لیے ہیں۔ ان میں سے کچھ رائج بھی ہو گئے ہیں۔ مثلاً:

اردو مصدر، دبانا؛ حاصل مصدر (اردو)، دبش [عامیانہ لفظ ہے، پڑھے لکھوں میں رائج نہیں ہوا۔]

فارسی مصدر، زیبیدن؛ مضارع، زیبد؛ حاصل مصدر (اردو)، زیبائش [اردو میں رائج ہے۔ فارسی میں نہیں ہے۔ فارسی میں ہوتا تو زیبش ہوتا۔]

فارسی مصدر، فہمیدن؛ مضارع، فہمد؛ حاصل مصدر (اردو)، فہمائش [اردو میں رائج ہے۔ فارسی میں نہیں ہے۔ اور اردو میں بھی اس کے معنی وہ نہیں ہیں جو فہمیدن سے برآمد ہوتے۔]

اردو مصدر، گرمانا؛ حاصل مصدر (اردو)، گرمائش [عامیانہ لفظ ہے۔ پڑھے لکھوں میں رائج نہیں ہوا۔]

اسی طرح، کسی نے 'رہنا' سے 'رہائش' بنا لیا ہے۔ یہ لفظ بھونڈا تو ہے ہی، غلط اس لیے بھی ہے کہ اگر 'رہنا' سے حاصل مصدر بقاعدہ فارسی بنے گا تو 'رہش' ہوگا نہ کہ 'رہائش'

□□□

رابطہ:
29-C, Hastings Road,
Civil Lines
Allahabad (U.P.)

تحریر: آر. کے. بھٹ
ترجمہ: فاخر شبیر عباسی

ہندوستان میں اردو کی صورت حال

ہندوستان کا لسانی منظر نامہ:

ہندوستان روایتی طور پر ایک تکثیر پسند ملک رہا ہے۔ ایک کثیر لسانی، کثیر مذہبی اور کثیر ثقافتی ملک جہاں تہذیب کی گونا گوں تھیں اور زبانوں اور بولیوں کی بہتات ہے۔ ہندوستانی سیاق میں فی الواقع تعلیم یافتہ ہونے کا مطلب کثیر اللسان ہونا ہے، یعنی کم از کم دو یا تین زبانوں سے واقفیت۔ ہندوستان جیسے کثیر اللسان ملک میں جہاں ایک بلین سے بھی زیادہ بولنے والے 28 ریاستوں اور 7 مرکز کے زیر انتظام علاقوں میں پھیلے ہوئے ہیں، زبان کی شناخت کوئی آسان کام نہیں ہے۔ 1991 کی مردم شماری رپورٹ (2001 کی مردم شماری کے اعداد و شمار اب تک دستیاب نہیں ہیں) کے مطابق ہمارے یہاں 114 زبانیں اور 216 مادری زبانیں ہیں جن میں سے ہر ایک کے 10,000 سے زائد بولنے والے ہیں۔ تقریباً سبھی ہندوستانی ریاستوں میں لسانی اقلیتیں موجود ہیں اور سبھی زبانیں بعض ریاستوں میں اقلیتی زبانیں ہیں۔

یہاں 34 زبانوں میں اخبارات شائع ہوتے ہیں۔ ساہتیہ اکادمی ادبی مقاصد کے لیے 22 زبانوں کو تسلیم کرتی ہے۔ 67 زبانیں کسی نہ کسی سطح پر تعلیم کے لیے استعمال کی جاتی ہیں۔ آل انڈیا ریڈیو 104 زبانوں میں پروگرام نشر کرتا ہے۔ تقریباً 50 تحریری زبانیں ہیں جن میں کتابیں دستیاب ہیں۔

اس مقالے کے تین حصے ہیں: (1) اردو کا تاریخی پس منظر (2) اردو آزادی کے بعد اور (3) قابل توجہ میدان اور مستقبل کا لائحہ عمل۔

1— اردو کا تاریخی پس منظر:

اردو کی شناخت محض ایک وسیع پیمانے پر بولی جانے والی یا عام فہم زبان کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک ایسی زبان کی ہے جس کی ایک قابل توجہ ثقافتی اہمیت اور مقامی رنگ ہے۔ یہ زبان گذشتہ آٹھ سو برسوں کی ہندوستان کی عظیم وراثت کی نمائندگی کرتی ہے۔

تاریخی اعتبار سے، اردو کا فروغ بارھویں صدی کے اواخر میں اپ بھرنش کے ذیلی علاقے سے شمال مغربی ہندوستان تک پھیلے ہوئے علاقے میں مختلف لسانیاتی طرز زندگی کے ساتھ آنے والے مسلمانوں کے زیر اثر ہوا۔ عہد وسطیٰ تک زبان کے مختلف ذیلی گروہوں کے ذریعے اس ملی جلی زبان کو مختلف ناموں سے جانا جاتا تھا جیسے 'ہندوی'، 'زبان ہندی'، 'ہندی'، 'زبان دہلی'، 'ریختہ'، 'گجری'، 'دکھنی'، 'زبان اردوئے معلی'، 'زبان اردو' یا صرف 'اردو'۔ اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ گیارھویں صدی کے آخر میں لفظ 'ہندوستانی' رائج تھا جو آگے چل کر اردو کا مترادف بن گیا۔ یہ شہر دلی کی بھی نمائندگی کرتا تھا جو صدیوں تک مغل حکمرانوں کا پایۂ تخت تھا۔ عظیم فارسی عالم امیر خسرو (1253-1325) نے اس نئی تشکیل شدہ زبان میں، جسے اس وقت 'ہندوی' کہا جاتا تھا، دوہے اور پہیلیاں لکھیں۔ حالانکہ، ان کے کچھ ہی دوہے، پہیلیاں اور ریختے محفوظ رہ سکے، خسرو کا اصل متن نسلوں کی زبانی ترسیل سے غیر محسوس طریقے سے تبدیل ہو گیا۔ خسرو نے جو زبان استعمال کی وہ یا تو خالص کھڑی بولی ہے یا برج کے ساتھ ملی ہوئی زبان ہے۔ ان کے گیت مکمل طور سے برج بھاشا میں ہیں۔

کھڑی بولی کے کم ترقی یافتہ ادب پر برج نے بڑا گہرا اثر چھوڑا۔ قدیم شاہی دارالحکومت کی دوسری زبانوں اور بولیوں کے مقابلے میں برج کی ادبی روایت کہیں زیادہ تونگر تھی، جس کا عکس دوسری ابھرتی ہوئی زبانوں کے فروغ میں جھلکتا تھا۔

1.1— دکنی:

ہندی، ہندوی یا دہلوی زبان جس کی نشو ونما شمال میں صوفیوں، سنتوں اور عوام کے زیر سرپرستی ہو رہی تھی، بہت پہلے چودھویں صدی میں جنوبی ہند میں جڑ پکڑ چکی تھی اور 1326 میں محمد بن تغلق کے عہد میں شاہی حکم سے جنوب کی جانب دہلی کی پوری آبادی کے جبراً کوچ کے بعد ایک اہم ادبی وسیلہ بن چکی تھی۔ دکنی نے اپنے نئے مسکن میں شاہی سرپرستی حاصل کی۔ وہاں کی مقامی زبانوں سے تصادم کے نتیجے میں، دکنی کھڑی بولی میں بعض نمایاں خصوصیات واضح ہوئیں جو اصل کھڑی بولی سے مختلف تھیں اور اسے دکنی کے نام سے جانا جانے لگا۔

اردو شاعری کو گہرا مقامی رنگ اور مواد فراہم کرنے میں دکنی شاعروں

یہ مضمون گذشتہ دنوں مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدر آباد کی جانب سے جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی میں منعقد ایک سیمینار میں پڑھا گیا۔

اور ادیبوں کا نمایاں کردار رہا ہے۔ گولکنڈہ، بیجاپور اور حیدرآباد میں لکھی گئی طویل نظمیں ہندوستانی تصورات میں ڈوبی ہوئی ہیں۔ غزل کو بھی اس کی سرحدوں کی توسیع سے تازگی حاصل ہوئی اور اس میں نئے ہندوستانی پیکر اور علامتوں کو جگہ ملی۔

1.2—شمال میں اردو (دہلی۔لکھنؤ):

شمالی ہند میں تمام سرکاری مقاصد کے لیے اردو کا استعمال کبھی نہیں ہوتا تھا، یہاں تک کہ مغلوں کے عہد حکومت میں ضلع انتظامیہ کی سطح پر بھی نہیں کیوں کہ فارسی نے شاہی دربار میں اس کے لیے جگہ ہی نہیں چھوڑی تھی۔ اردو اس وجہ سے پروان چڑھی کیونکہ وہ عام لوگوں کی منظور نظر تھی اور اس کی جڑیں ہندوستانی وراثت میں بہت گہری تھیں۔

روزمرہ کی عام زبان نے، جو تقریباً پانچ صدیوں سے شمال میں نشو ونما پا رہی تھی، شاہ جہاں کے عہد میں شاہی دارالحکومت کے واپس پرانے شہر دہلی منتقل ہوجانے سے بتدریج دہلی میں پھر سے ایک قابل اعتماد مرکزیت حاصل کر لی۔ یہاں قدرتی طور پر کھڑی بولی میں دلچسپی کی از سر نو تجدید ہوئی، جو شہر دہلی اور آس پاس کے علاقوں میں سب سے زیادہ بولی جانے والی زبان تھی۔

کھڑی بولی کو اردوئے معلی کا شاہی خطاب حاصل ہونے کے بعد برج بھاشا جو اب تک دہلی میں اپنے قدم جمائے ہوئے تھی، بالآخر اپنے ہی علاقے میں پسپا ہوگئی۔ چندر بھان 'برہمن' اور ولی رام ولی نے دہلی میں غزلیں لکھیں۔

دہلی کے مرکز بن جانے سے اردو کا دائرہ دور دراز علاقوں میں وسیع ہونے لگا۔ آندھرا پردیش، بہار، دہلی، گجرات، ہریانہ، مدھیہ پردیش، مہاراشٹر، کرناٹک، پنجاب، راجستھان، سندھ اور اتر پردیش کے علاقوں میں اردو کے متعدد مواصلاتی مراکز وجود میں آئے۔ شعری نشستیں ہونے لگیں، کتابیں لکھی گئیں اور زبان کا فروغ وسیع پیمانے پر ہونے لگا۔ محمد شاہ (1719-1748) کے عہد میں بعض فارسی گو شعرا نے بھی دھیرے دھیرے اردو میں طبع آزمائی شروع کردی۔

دانشور طبقہ اب بھی خاص طرز میں لکھی جانے والی فارسی کی سرپرستی کر رہا تھا لیکن اردو حلقوں میں ادب کو عوامی اور آفاقی بنانے کے تئیں ایک واضح رجحان تھا۔ ہر طبقے کے لوگوں نے اس ادب کا خیر مقدم کیا جو عوام کی ضرورتوں اور آرزوؤں کی عکاسی کرتا تھا۔

جب 'فغاں'، 'ضاحک'، 'سودا'، 'میر'، 'انشا'، 'جرأت'، 'حسرت'، اور 'میر حسن' جیسے شعرا دلی چھوڑ کر لکھنؤ چلے گئے تو لکھنؤ اردو کے ایک نئے مرکز کی حیثیت سے سامنے آیا جو اٹھارھویں صدی کے آخر اور انیسویں صدی کے اوائل میں ادب کے ایک بڑے مرکز میں تبدیل ہوگیا۔

1.3—نثر نگاری:

فورٹ ولیم کالج کی کوششوں کو آگے چل کر 1825 میں قائم ہونے والے دلی کالج کے ذریعے فروغ حاصل ہوا جہاں جدید علوم اور دوسرے مضامین کی تعلیم اردو کے ذریعے دی جاتی تھی۔ یہاں بھی جلد ہی اردو میں مناسب کتابوں کی ضرورت محسوس کی گئی اور ایک ایجوکیشن کمیٹی، خاص طور سے ہندوستان میں مقامی زبانوں کی ترقی کے لیے قائم سوسائٹی (Society for Promotion of Vernaculars) نے ریاضی، الجبرا، حیاتیات، نباتات، علم کیمیا، معاشیات، جیومیٹری، تاریخ، قانون، ادویہ، فلسفہ، طبعیات، سیاسیات اور متعلقہ مضامین پر بڑی تعداد میں کتابیں اردو میں ترجمہ کرنے کی اسکیم شروع کی۔

اردو اور دیوناگری رسم الخط میں اس وقت کیے گئے ایک ادبی جائزے سے یہ انکشاف ہوا کہ ہندی اور اردو کے درمیان کی خلا بہت وسیع نہیں تھی۔ جبکہ اردو میں ایسے الفاظ کی تعداد کچھ زیادہ تھی جن کا ماخذ فارسی تھا اور دیوناگری میں لکھی جانے والی ہندی میں سنسکرت الفاظ کا تناسب زیادہ تھا۔ بعض مصنفین اب بھی اردو کو ہندی سے ہی منسوب کرتے تھے، جبکہ ہندوستانی تقریباً اس کے مترادف کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔

1.4—انتظامیہ میں اردو:

اردو، جس کی نشو ونما عام بول چال کی ایک زبان کی حیثیت سے ہوئی تھی، جلد ہی اعلیٰ خیالات کی ترجمان اور علمی زبان بن گئی۔ جبکہ انگریزی دھیرے دھیرے فارسی کو متعدد انتظامی میدانوں سے باہر نکال رہی تھی، اردو نے ضلع انتظامیہ سطح پر محصولات اور عدالتی شعبوں میں اپنے لیے کچھ جگہ تلاش کرلی۔

جیسے جیسے وقت گذرتا گیا، عدالتی فیصلے انگریزی میں دیے جانے لگے اور اردو کا استعمال عرضیاں داخل کرنے، زمینوں کا ریکارڈ رکھنے اور اکثر ہندی بولی جانے والی ریاستوں میں شہادتیں قلمبند کرنے تک محدود ہوکر رہ گیا۔ وقت کا تقاضا تھا کہ قوانین اور دستور العمل کی کتابیں اردو میں ترجمہ کی جائیں۔ یوں سرکاری سرپرستی نیز مصنفین و ناشرین کی مہم کے ذریعے لاتعداد کتابوں کی اشاعت عمل میں آئی۔

1.5—دارالترجمہ حیدرآباد:

بیسویں صدی کا ایک نہایت اہم واقعہ حیدرآباد میں عثمانیہ یونیورسٹی کا قیام تھا جہاں اعلیٰ سطح تک اردو ذریعہ تعلیم تھی۔ اس زمانے میں قدرتی طور پر ایک ایسی تنظیم کی اشد ضرورت محسوس ہوئی جو گریجویشن سطح کی کتابوں کا ترجمہ

کرنے کا کام انجام دے سکے۔ اس ضرورت کے تحت حیدر آباد ہی میں دارالترجمہ کا قیام عمل میں آیا جہاں بڑی تعداد میں ادبی اور سائنسی علوم کی معیاری کتابوں کا ترجمہ اردو میں کیا گیا۔

1.6 — برطانوی عہد میں اردو:

ہندوستان کے لسانی اور تہذیبی نقشے پر اردو کو جو نمایاں مقام حاصل تھا وہ انیسویں صدی میں ہی انگریزوں کی نو آبادیاتی پالیسیوں کی بنا پر زوال پذیر ہونے لگا۔ انگریزوں کو یہ بات قطعی پسند نہیں تھی کہ ہندو اور مسلمان ایک ساتھ ایک زبان استعمال کریں۔ کیونکہ وہ دیکھ رہے تھے کہ یہ زبان ہندوستانی سیاست میں میل ملاپ کے ایک طاقتور ذرائع کی شکل اختیار کر رہی تھی۔ اس لیے انھوں نے ہندی اور اردو کے درمیان اختلاف کے شعلوں کو ہوا دے کر ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان فرقہ وارانہ تصادم اور مخالفت کو بڑھاوا دیا۔ یہ ''پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو'' کی ان کی پالیسی کے عین مطابق تھا۔ وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ انھوں نے اردو زبان کی طاقت اور مرتبے کو کم کرنے کی مسلسل کوششیں کیں۔ انگریز سبھی ہندوستانی زبانوں کو ''دیسی'' (Vernacular) زبان کہتے تھے، ایسی زبان جس کی کوئی علمی بنیاد نہیں تھی۔ یہ بے شک حقیقت سے بعید بات تھی لیکن انگریزوں کی اس پیش کردہ پالیسی سے میل کھاتی تھی جس کے تحت ہندوستانیوں کو انگریزی زبان میں تعلیم دینا اور انھیں ان کی مقامی زبان سے ہر ممکن حد تک دور رکھنا تھا۔ میکالے نے 1835 کی اپنی مشہور روداد میں واضح طور پر یہ اعلان کیا تھا کہ ہندوستان میں تعلیم کا مقصد ایسے ہندوستانی تیار کرنا ہونا چاہیے جو نسل اور رنگ کے اعتبار سے تو ہندوستانی ہوں لیکن ان کا ذہن اور مزاج برطانوی ہو۔

ہندوستان کی جدوجہد آزادی کے عروج کے ساتھ ہی، مہاتما گاندھی نے زبان کے مسئلے کی فرقہ واریت اور انگریزوں کے ذریعے دیے گئے سیاسی رنگ کو محسوس کرلیا۔ اس لیے انھوں نے ملک کی قومی زبان کے طور پر روز مرہ استعمال میں آنے والی ''ہندوستانی'' زبان کا ایک مخلوط تصور پیش کیا جو دونوں رسم الخطوں میں لکھی گئی ہو۔ حالانکہ، آزادی کے بعد مخلوط ہندوستانی تہذیب کی زبان کے طور پر 'ہندوستان' کی گاندھی جی کی پیش کش کو قبول عام حاصل نہ ہوسکا۔ ملک کی تقسیم کے ساتھ ہی ہندوستانی بھی واضح طور پر دو زبانوں، اردو اور ہندی میں تقسیم ہوگئی اور اردو پاکستان کی اور ہندی ہندوستان کی قومی زبان قرار پائی۔

2 — اردو آزادی کے بعد:

بیسویں صدی میں ایک نئی بات سامنے آئی۔ بعض حلقوں میں اردو کو مسلمانوں کی زبان کے طور پر پیش کیا جانے لگا۔ پاکستان بن جانے کے بعد اس کا تعلق صرف مسلمانوں سے جوڑنے کی کوششیں کی گئیں۔ حالانکہ ثقافتی اعتبار سے اردو اب بھی ہندوستان میں ہندوؤں اور مسلمانوں کا مشترک ورثہ تھی۔ نیز اردو مخلوط ہندوستانی تہذیب کی نمائندگی کرتی رہی جس میں نہ صرف ہندوؤں اور مسلمانوں نے بلکہ سکھوں، بودھوں، عیسائیوں اور جینیوں نے بھی اہم کردار ادا کیا۔ آزادی کے لیے لڑنے والے اکثر رہنماؤں کی زبان اردو ہی تھی۔ اسی زبان نے ''انقلاب زندہ باد'' کا نعرہ دیا تھا۔ صرف مولانا آزاد، حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر انصاری، رفیع احمد قدوائی اور دوسرے مسلم کانگریسی رہنما ہی نہیں تھے جو اردو زبان و ادب کی خدمت کر رہے تھے بلکہ مرکز یا ریاستی سطح پر کانگریس کی تقریباً تمام اعلیٰ قیادت یا تو اردو ثقافت کی شریک کار اور فعال معاون تھی یا اردو زبان کی خوبصورتی اور ہندوستان کی جدو جہد آزادی میں اس کے رول کی قدر دان تھی۔

آزاد ہندوستان کے آئین کے نفاذ کے ساتھ ہی اردو کو آٹھویں جدول میں شامل کر دیا گیا۔ ملک کے کثیر لسانی منظر نامے میں اردو کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہوئے حکومت ہند نے 1969 میں اردو کی صورت حال کو بہتر بنانے کے لیے ایک اہم قدم اٹھایا۔ اس نے قومی سطح پر ایک ''ترقی اردو بورڈ'' اور اس کے معتمد کی حیثیت سے کام کرنے کے لیے ترقی اردو بیورو قائم کیا۔ اس کے پروگراموں اور منصوبوں کی تکمیل کے لیے حکومت ہند کے ذریعے خاصا فنڈ دیا گیا۔

1972 میں حکومت ہند نے ایک اعلیٰ اختیاری کمیٹی کا تقرر کیا جس کا نام اس کے چیئرمین جناب اندر کمار گجرال کے نام پر گجرال کمیٹی رکھا گیا جو آگے چل کر ہندوستان کے وزیر اعظم بنے۔ اس کمیٹی نے زندگی کے ہر شعبے کے لوگوں سے بڑی تعداد میں شہادتیں جمع کیں اور 8 مئی 1975 کو ایک تفصیلی رپورٹ پیش کی۔ اس کی سفارشات جن کی تعداد 220 تھی، بہت زیادہ بحث کا موضوع بنی رہیں۔

حکومت ہند نے سی آئی آئی ایل (CIIL) کی سرپرستی میں ہماچل پردیش اور لکھنؤ میں اردو اساتذہ کے لیے تربیتی ادارے بھی قائم کیے۔ مرکزی حکومت کی پیروی میں ریاستی حکومتوں نے بھی اردو کی صورت حال کو بہتر بنانے کے لیے قدم اٹھانے شروع کیے۔ 1972 میں ریاستی سطح کی پہلی اردو اکادمی اتر پردیش میں قائم ہوئی۔ اس وقت ملک میں پندرہ اردو اکادمیاں کام کر رہی ہیں۔ آندھرا پردیش میں بعض مخصوص مقاصد کے لیے اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دیا گیا۔ اتر پردیش اور بہار میں اردو جاننے والے لوگوں کے لیے کچھ حد تک روزگار کے مواقع فراہم کیے گئے۔

اردو بولنے والی آبادی کے لیے سب سے بڑی فکر مندی اس بات کی

رہی ہے کہ سہ لسانی فارمولے پر اس طرح سے عمل درآمد نہیں کیا گیا جیسا کہ سوچا گیا تھا۔ جہاں تک شمالی ریاستوں کا تعلق ہے، وہاں اس فارمولے پر عمل درآمد تو ہوا لیکن اس طرح سے کہ سرکاری اسکولوں میں اردو کی تعلیم کا کوئی انتظام نہیں کیا گیا۔

قومی کمیشن برائے تعلیم (1980) نے ابتدائی سے لے کر اعلیٰ ثانوی سطح تک کے لیے اردو زبان میں کتابیں شائع کروا کے ایک اہم قدم اٹھایا تھا۔ یہ کتابیں بے حد مقبول ہوئی تھیں۔

1996 میں حکومت ہند نے ترقی اردو بورڈ کی تشکیل نو اور ایک خود مختار ادارے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے قیام کے ذریعے ایک بڑا قدم اٹھایا۔ اس تنظیم سے یہ توقع کی گئی کہ یہ اردو زبان کی ترقی کے تئیں حکومت ہند کی پالیسیوں کے عمل درآمد کے لیے ایک اہم مشینری کا کام کرے گی۔

2.1 ـــ اردو بولنے والی آبادی:

1991 کی مردم شماری رپورٹ (2001 کی مردم شماری رپورٹ ابھی تک دستیاب نہیں ہوئی ہے) کے مطابق ہندوستان میں اردو بولنے والوں کی تعداد تقریباً 44 ملین ہے۔ ریاست اتر پردیش میں اردو بولنے والوں کی تعداد سب سے زیادہ ہے اس کے بعد یکے بعد دیگرے بہار، آندھرا پردیش، مہاراشٹر اور کرناٹک کا نمبر آتا ہے۔ ان سبھی ریاستوں میں کل ملا کر ہندوستان کی آبادی کا 85 فیصد اردو بولنے والا طبقہ رہتا ہے۔ دہلی آج بھی اردو ادب اور اشاعت کا سب سے بڑا مرکز ہے۔ اردو جنوبی ایشیا کی ایک بڑی زبان ہے جو برصغیر سے باہر رہنے والے جنوب ایشیائی مسلمانوں کے مابین رابطے کی ایک اہم کڑی ہے۔

اردو کو ہندوستان میں ایک نمایاں مقام حاصل ہے اور یہ ہندوستان کی سرکاری زبانوں میں سے ایک ہے۔ جموں اور کشمیر میں اردو ریاست کی سرکاری زبان ہے۔ ابتدائی اور ثانوی سطح کے اکثر اسکولوں میں اردو کی تعلیم دی جاتی ہے جبکہ گریجویٹ اور پوسٹ گریجویٹ سطح پر طلبہ کی تعداد میں واضح طور پر اضافہ ہو رہا ہے۔ حال ہی میں این۔ آئی۔ ای۔ پی۔ اے۔ (NIEPA) کے ذریعے لیے گئے ایک جائزے میں ابتدائی اور اعلیٰ ابتدائی سطح کے طلبہ کی ترجیح دکھائی گئی ہے جو اردو کو ذریعہ تعلیم کی حیثیت سے جاری رکھنا چاہتے ہیں۔

2.2 ـــ عالمی پیمانے پر اردو:

بیسویں صدی کے آخر تک پوری دنیا میں دو زبانوں کے بولنے والوں کی تعداد تقریباً ایک بلین تک پہنچ چکی تھی۔ یہ زبانیں ہیں چینی جو کرۂ ارض کے سب سے زیادہ آبادی والے ملک کی سرکاری زبان ہے اور انگریزی جو آج عالمی پیمانے پر سب سے زیادہ بولی اور پڑھی جانے والی زبان ہے۔

آبادیاتی (Demographic) اہمیت کے اعتبار سے، زبان کے دوسرے طبقے میں، زبانوں کے دو 'جوڑے' شامل ہیں جن کے بولنے والوں کی تعداد کل ملا کر نصف بلین (500,000,000) سے بھی زیادہ ہے۔ ان میں پہلا جوڑا ہندی + اردو پر مشتمل ہے جو اپنے مختلف رسم الخطوں کے باوجود بولنے میں یکساں طور پر قابل فہم ہیں۔ اگر قریبی طور پر وابستہ پنجابی زبان، یا دوسری ہندوستانی زبانوں کے بولنے والوں کی ہندی اور اردو کی سمجھ یا دراوڑی زبان کے بولنے والوں میں بغیر کسی مزاحمت کے ہندی + اردو کی وسیع فہمی کو تسلیم کیا جائے تو ہندی + اردو کا مقام بھی اسی طبقے میں آتا ہے جو چینی اور انگریزی کا ہے، ایسی زبان جس کے تقریباً ایک بلین سننے والے ہیں۔

زبانوں کا دوسرا جوڑا جس کے بولنے والے نصف بلین سے زیادہ ہیں ہسپانوی + پرتگالی زبانوں پر مشتمل ہے۔

مزید تین زبانیں جن میں سے ہر ایک کے بولنے والوں کی تعداد دوسو ملین سے اوپر ہے، وہ ہیں روسی، بنگالی اور عربی۔

پاکستان میں کراچی اور حیدرآباد جیسے شہروں اور سندھ کی جنوبی سرحد کے باشندوں میں اکثریت کی مادری زبان اردو ہے۔ پاکستان کی 8 فیصد آبادی اردو اپنی پہلی زبان کے طور پر بولتی ہے جبکہ تقریباً 48 فیصد لوگوں کی مادری زبان پنجابی ہے۔ بہر حال یہ پاکستان میں رابطے کی زبان ہے، اور پاکستان کے اسکولی نظام میں اردو کی تعلیم ضروری ہے۔ یہ واضح ہے کہ شہری مراکز میں اردو بولنے والوں کی تعداد میں تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے۔

2.3 ـــ ریاستوں کی تنظیم نو:

اردو کی صورت حال میں نوعی تبدیلیوں کا آغاز پہلی مرتبہ آزادی کے بعد اور آگے چل کر لسانی بنیادی پر ریاستوں کی تنظیم نو کے بعد ہوا۔ آزادی کے بعد کے ناسازگار حالات کی بنا پر اردو زبان کا فروغ اس طرح سے نہیں ہو سکا جیسا کہ توقع تھی۔ ایک اہم عنصر جس نے زبانوں کے فروغ کو بڑھاوا دیا وہ تھا 1956 میں لسانی بنیاد پر ریاستوں کی تنظیم نو۔ اس کے نتیجے میں متعلقہ علاقائی زبانوں کو ان ریاستوں میں سرکاری زبان کا درجہ دے دیا گیا۔ کچھ ریاستوں جیسے آندھرا پردیش، ہریانہ، پنجاب اور اتر پردیش میں اردو نے اپنا مقام کھو دیا۔ مثال کے طور پر، تقسیم کے بعد کے پنجاب میں اردو کی بجائے پنجابی اور ہندی پڑھائی جانے لگیں۔ مخلوط پنجاب ریاست کی دوبارہ تقسیم کے بعد، پنجابی پنجاب کی اور ہندی ہریانہ کی سرکاری زبان بن گئی۔ اسی طرح اتر پردیش میں جہاں آزادی سے قبل بعض سرکاری مقاصد کے لیے اردو کا استعمال کیا جاتا تھا، اب ترک کر دیا گیا۔ اردو بڑی ریاستوں کی سرپرستی سے محروم ہوگئی اور محض جموں وکشمیر ریاست کی سرکاری زبان بن کر رہ گئی (دراصل جس وقت اردو کو جموں وکشمیر میں سرکاری زبان کا درجہ دیا گیا۔ اس سے سو

برسوں سے بھی زیادہ عرصہ قبل سے اسے اس شاہی ریاست میں ایک ذیلی سرکاری زبان کی حیثیت حاصل تھی)۔ اردو بولنے والے لوگوں کا دوسرا سب سے بڑا گروپ اتر پردیش، آندھرا پردیش، بہار، مہاراشٹر، گجرات اور کرناٹک میں اور تیسرا سب سے بڑا گروپ ہریانہ، ہماچل پردیش، پنجاب، راجستھان، چنڈی گڑھ، دہلی، گوا، دمن اور دیو میں ہے۔ اردو بولنے والی آبادی کا یہ وسیع طبقہ تمام ہندوستانی ریاستوں اور مرکز کے زیر انتظام علاقوں میں پھیلا ہے۔ ریاستوں کی لسانی تنظیم نو کے بعد اسے ان تمام ریاستوں میں ایک اقلیتی زبان کا درجہ حاصل ہوگیا ہے۔

2.4— تعلیم میں اردو:

پورے ملک میں اسکول سے یونیورسٹی تک تعلیم کی ہر سطح پر ایک مضمون ہونے کے علاوہ، ملک بھر میں خاص طور سے آندھرا پردیش، مہاراشٹر، بہار، مغربی بنگال، مدھیہ پردیش، جموں وکشمیر اور کرناٹک جیسی ریاستوں میں اردو میڈیم اسکول بڑی تعداد میں کام کر رہے ہیں۔ پورے ملک میں پچاس سے بھی زیادہ یونیورسٹیوں میں پوسٹ گریجویٹ سطح پر اردو پڑھائی جارہی ہے اور تحقیق کی سہولیات دستیاب ہیں۔ سرکاری اداروں اور غیر سرکاری تنظیموں کی بڑی تعداد جیسے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، سینٹرل انسٹی ٹیوٹ آف انڈین لینگویجز (CIIL) میسور، ادارہ ادبیات اردو، حیدر آباد، انجمن ترقی اردو ہند، غالب اکیڈمی، غالب انسٹی ٹیوٹ، دہلی اور مختلف ریاستی اردو اکادمیاں اردو کے فروغ کے لیے کام کررہی ہیں۔ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی (MANUU) حیدر آباد، امتیازی طور پر اردو زبان میں گریجویٹ اور پوسٹ گریجویٹ سطح پر متعدد پروگرام چلا رہی ہے۔ اسکول کی سطح پر اردو کی تعلیم میں بعض خامیاں ہیں، خاص طور سے مختلف نصاب تعلیم میں کتابوں کی عدم دستیابی اور اردو میں تربیت یافتہ اساتذہ کی ناکافی تعداد۔

2.5— انتظامیہ میں اردو:

جموں وکشمیر ملک کی واحد ریاست ہے جہاں کی سرکاری زبان اردو ہے اور انتظامی امور میں اس کا استعمال مختلف سطحوں پر خاص طور سے شعبۂ محصولات، عدلیہ، انتظام عامہ اور متعلقہ شعبوں میں کیا جاتا ہے۔ حالانکہ سکریٹریٹ سطح پر اکثر کام انگریزی میں انجام دیے جاتے ہیں۔ اکثر دوسری ریاستوں میں اردو دوسری زبان ہے لیکن عملی طور پر اردو میں بہت سے کام نہیں کیے جاتے ہیں۔

2.6— اردو اور پرنٹ میڈیا:

اردو ہندوستان میں ذرائع ابلاغ کا ایک اہم وسیلہ رہی ہے۔ آزادی کے پہلے سے ہی بڑی تعداد میں اخبارات، رسائل وجرائد اس زبان میں شائع ہوتے آئے ہیں۔ موجودہ عہد میں تقریباً 300 اردو اخبارات اور 100 رسائل وجرائد شائع ہو رہے ہیں۔ 70 اخبارات یو این آئی کی اردو سروس کی خدمات حاصل کر رہے ہیں۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان بھی تقریباً 50 اخبارات کے لیے یو این آئی کی سہولیات حاصل کرنے کے لیے امدادی رقم مہیا کراتی ہے۔ تقریباً 70 اخبارات / رسائل انٹرنیٹ پر دستیاب ہیں۔

2.7— اردو اور الیکٹرانک میڈیا:

پورے ملک میں خاص طور سے جموں وکشمیر، اتر پردیش، بہار، مہاراشٹر، دہلی، آندھرا پردیش وغیرہ ریاستوں میں آل انڈیا ریڈیو کے مختلف اسٹیشن اردو میں متعدد پروگرام نشر کر رہے ہیں۔ دور درشن بھی اردو کے کئی پروگرام نشر کرتا ہے۔ ایک امتیازی اردو چینل ای ٹی۔ وی اردو اور بعض مزید ٹی وی چینل بشمول دور درشن مستقبل قریب میں اردو کے خصوصی چینل شروع کرنے کا منصوبہ بنا رہے ہیں۔ آڈیو ویڈیو مواد SMS پیغام آلات اور سافٹ ویئر اردو میں تیار کیے جارہے ہیں۔

2.8— اردو اور سنیما:

یہ کہنا شاید مبالغہ نہ ہوگا کہ ہندوستانی سنیما نے اردو زبان کے ذریعے ہی ترقی اور عروج حاصل کیا ہے۔ اردو کے فروغ میں ہندوستانی سنیما کا رول کافی نمایاں رہا ہے۔ اس بات کو یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ اردو کی ترقی کے لیے ہندوستانی سنیما نے غیر معمولی کردار ادا کیا ہے۔ کافی فلمیں اردو میں لکھی گئی ہیں۔ بالی وڈ فلموں کی ایک بڑی تعداد کے مکالمے، گیت اور فلمی منظر نامے مکمل طور پر اردو میں ہیں۔ اردو نے پورے ملک میں ہندوستانی سنیما کی اپنے ناظرین کے ساتھ براہ راست تعلق قائم کرنے میں مدد کی ہے اور سنیما کو قبول عام بخشا ہے۔

3— قابل توجہ میدان اور مستقبل کا لائحۂ عمل:

ملک میں اردو کی تاریخی اور موجودہ صورت حال کے جائزے کے بعد مختصر طور پر میں ان مختلف میدانوں کی نشاندہی کرنا مناسب سمجھتا ہوں جن میدانوں میں ملک میں اردو کو مزید فروغ دینے کے لیے کام کرنے کی ضرورت ہے۔

3.1— فاصلاتی تعلیم:

حالانکہ مختلف تنظیمیں / یونیورسٹیاں جیسے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، جامعہ ملیہ اسلامیہ وغیرہ پہلے سے ہی فاصلاتی تعلیم کے ذریعے اردو میں مختلف کورس چلا رہی ہیں، پھر بھی اس کو مزید توانائی بخشنے کی بڑی گنجائش ہے۔ مزید تنظیموں / یونیورسٹیوں کو اس میدان میں آنا چاہیے اور ایسے کورسوں کا نیٹ ورک وسیع کرنے میں تعاون کرنا چاہیے۔

اس سے بہتر نصابی مواد تیار کرنے اور اردو میں آڈیو ویڈیو یونیز آن لائن پروگرام تیار کرنے میں بھی مدد ملے گی۔

3.2۔۔۔ترجمہ:

اردو کو جدید علوم کی زبان ہونا چاہیے یعنی سائنس، ٹیکنالوجی، سماجی علوم، میڈیا اور ابلاغ کے میدانوں کا مکمل علم اردو کے ذریعے فراہم کیا جانا چاہیے۔

اس سلسلے میں پہلے سے ہی سرگرمیاں جاری ہیں لیکن اس میں مزید کام کرنے کی ضرورت ہے جس سے اردو میں سائنس، آرٹ، ٹیکنالوجی اور سماجی علوم غرض ہر قسم کی کتابیں دستیاب ہوں اور اسے منظم طریقے سے آگے بڑھایا جائے۔ ملک میں پہلے سے ہی ایک ''قومی کمیشن برائے ترجمہ'' قائم کرنے کی بات چل رہی ہے اور اگر یہ قائم ہو جاتا ہے تو یہ ملک میں ترجمے کی توسیع کے ضمن میں ایک اہم رول ادا کرے گا اور اردو کو اس مشن میں ایک اہم زبان کی شکل میں کام کرنا چاہیے۔ اس وقت ساہتیہ اکادمی، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان اور مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی اس کام میں شریک ہیں جنھیں مزید قوت بخشنے کی ضرورت ہے۔

3.3۔۔۔رسم الخط اور خطاطی:

اردو خطاطی ہمارے قومی ثقافتی ورثے کا ایک اہم حصہ ہے جسے گذشتہ سیکڑوں برسوں سے محفوظ رکھا گیا ہے۔ اس آرٹ کو آئندہ نسلوں کے لیے محفوظ رکھنے اور ریاستی اور مرکزی سطح پر تربیتی مراکز قائم کرنے کی ضرورت ہے۔ ملک بھر کے عجائب گھروں میں خطاطی اور کتابت کے لیے بھی ایک حصہ مختص ہونا چاہیے تاکہ نمایاں کاموں کو محفوظ کیا جاسکے۔ نمائشوں کا انتظام کرنے کی ضرورت ہے جس سے ایک طرف تو اسے آسانی کے ساتھ سیکھنے کے قابل بنایا جاسکے اور دوسری طرف کمپیوٹر کے لیے بھی موزوں کیا جاسکے۔

3.4۔۔۔نمائشوں کے ذریعے کتابوں کا فروغ:

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان گذشتہ کئی برسوں سے اردو ناشرین کے لیے قومی سطح پر کتابی میلوں کا انعقاد کر رہی ہے۔ بہت سی دوسری تنظیمیں بھی یہ کام انجام دے رہی ہیں۔ اسے مزید مضبوط کرنے کی ضرورت ہے اور زیادہ سے زیادہ کتاب میلوں کے انعقاد کے ذریعے اردو کتابوں کو پڑھنے والوں کے گھروں تک پہنچانے اور موبائل وین کے استعمال سے دور دراز علاقوں تک پہنچنے کی ضرورت ہے۔

3.5۔۔۔کتب خانوں میں اضافہ کرنا:

مختلف غیر سرکاری تنظیموں اور اداروں کے ذریعے ملک بھر میں بڑی تعداد میں اردو کتب خانے اور اکثر کتب خانوں میں اردو کے شعبے قائم کیے گئے ہیں۔ چھوٹے قصبوں اور گاؤں میں اسی طرح کے کتب خانوں کے قیام کی ضرورت ہے جو اسکولوں میں اور پنچایت اور بلاک کی سطح پر کتابی گوشوں کی شکل میں ہوسکتے ہیں۔ ایسے کتب خانوں میں بچوں کے ادب کی دستیابی بے حد ضروری ہے۔

3.6۔۔۔انعامات اور وظائف:

مختلف اداروں اور تنظیموں کو مختلف سطحوں پر اردو طلبہ کے لیے انعامات اور وظائف کی اسکیمیں شروع کرنا چاہئیں۔

3.7۔۔۔اردو میں اسکولی تعلیم کو مضبوط کرنا:

ملک کی آبادی میں 10 فیصد اردو بولنے والا طبقہ ہے۔ ابتدائی اور ثانوی سطح پر اردو کی تعلیم کے لیے مناسب انتظامات کیے جانے چاہئیں۔ سبھی کیندریہ ودیالیوں اور نوودیہ ودیالیوں میں ایک مضمون اردو کا بھی ہونا چاہیے۔ ضرورت کے مطابق اردو اساتذہ کی تقرری کو اولیت دی جانی چاہیے۔ سروشکشا ابھیان کے تحت دستیاب فنڈ کا ایک مناسب تناسب اردو تعلیم کے لیے مختص کرنے کی ضرورت ہے۔

اردو بولنے والے لوگوں کے درمیان لڑکیوں کی تعلیم پر خاطر خواہ توجہ دی جانی چاہیے۔ قومی خواندگی مشن کے تحت بھی اردو کو ایک اہم وسیلے کی حیثیت اختیار کرنی چاہیے۔

3.8۔۔۔اردو ایف۔ ایم اسٹیشن:

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان جیسے اداروں، تنظیموں کو اردو کے پروگرام نشر کرنے کے لیے اردو ایف۔ ایم۔ اسٹیشن قائم کرنا چاہیے جس میں خاص طور سے موسیقی کے ساتھ ساتھ اردو تدریسی پروگرام بھی شامل ہوں۔

3.9۔۔۔قومی کمیشن برائے اردو:

ایک قومی کمیشن برائے اردو کا قیام عمل میں آنا چاہیے یا قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کو ہی پارلیمنٹ کے ایک ایکٹ کے ذریعے خصوصی اختیارات دیا جانا چاہیے تاکہ اردو سے متعلق تمام مسائل اس کے حلقۂ اثر میں آئیں اور اسے ایک مرکزی نگراں ادارے (Central Monitering Authority) کے رول کی ذمے داری دی جائے۔

3.10۔۔۔انتظامی۔ تکنیکی رجسٹروں کا اختراع:

ہندی۔ اردو میں سیاسی تقسیم اور بعض علاقوں میں ایک پر دوسری کو فوقیت دینے سے تعلیم، ذرائع ابلاغ اور انتظامیہ میں ان کے استعمال سے مختلف مسائل کھڑے ہوگئے ہیں۔ اہم مسائل ہیں انتظامی اصطلاحات اور فقروں کا مصنوعی اختراع، معیار بندی کی کمی، باہمی ربط اور کوششوں میں کمی۔ ہندی اور اردو کی مشترک بنیادوں کو نظر انداز کرنے اور اس کی قوت پر اعتماد نہ کرنے کی بنا پر بڑے مسائل پیدا ہوتے ہیں۔

زبان کے استعمال کو اس کی ابلاغ پذیری کے نقطۂ نظر سے اہمیت دی

جانی چاہیے نہ کہ ادبی طرز اظہار میں مہارت کی نمائش یا زبان کی شستگی کی بنیاد پر۔ ابلاغ پذیری کی قوت کو عام اور مروج اسلوب میں آسان، عام فہم اور غیر مبہم طرز اظہار کے استعمال سے مضبوطی حاصل ہوتی ہے۔ ہندوستان جیسے وفاقی جمہوری ڈھانچے میں، جہاں شرح خواندگی کا تناسب بہت کم اور زبانوں کی کثرت اور ان کی متعدد قسمیں اور بولیوں کے مختلف اسلوب ہیں، ابلاغ پذیری کو عمودی اور افقی محور کی مختلف سطحوں پر یقینی بنایا جانا چاہیے۔

3.11 — گاندھی جی کا نظریہ:

جب گاندھی جی نے 'ہندوستانی' کی موافقت ایک قومی زبان کی حیثیت سے کی تھی تو انھوں نے کہا تھا" دونوں زبانوں کی ہم آہنگی گنگا اور جمنا کے سنگم کی طرح خوبصورت ہوگی''۔ ان کے اس نظریے کی حمایت پنڈت جواہر لال نہرو، راجندر پرساد اور مولانا ابوالکلام آزاد نے بھی کی۔ نہرو نے مزید یہ اعلان بھی کیا کہ ہندوستانی کو ایک کل ہند زبان کا درجہ دیا جانا چاہیے (داس گپتا، صفحہ 111) یہاں یہ ذکر کرنا بے جا نہ ہوگا کہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے مختلف مضامین میں 16 تکنیکی اصطلاحات تیار کی ہیں، لیکن اس سلسلے میں مزید کام کرنے کی ضرورت ہے۔

3.12 — موجودہ سرکاری زبان پالیسی:

موجودہ سرکاری زبان کی پالیسی کو مدنظر رکھتے ہوئے، جہاں تک انتظامیہ میں ان کے استعمال کا تعلق ہے، ہندی اور اردو کی مشترک بنیادوں کو مضبوط کرنے کی بہت گنجائش ہے۔ ہندی اور اردو آج بھی ایک ترسیلی زبان کی دو ادبی قسمیں ہیں۔ اردو کے عام الفاظ کو اخذ کرنے کے علاوہ، ہندی نے اردو کے بعض اسالیب کو بھی اپنایا ہے۔ عوام کے ذریعے استعمال کیے جانے والے سلیس الفاظ اور طرز اظہار کو اختیار کرنے کے ذریعے نئی اصطلاحات اور غیر مانوس طرز اظہار کے غیر فطری اختراع کے مسئلے کو حل کیا جاسکتا ہے۔

3.13 — اردو کو سیاست سے الگ رکھنا۔

□□□

کلیات محمد قلی قطب شاہ

مرتبہ: سیّدہ جعفر

گولکنڈہ کا پانچواں تاجدار اور شہر حیدرآباد کا بنیاد گزار قلی قطب شاہ فنون لطیفہ کا قدر شناس اور خود ایک خوش فکر شاعر تھا۔ محمد قلی قطب شاہ کا یہ کلیات سیدہ جعفر صاحبہ نے تحقیقی انداز میں مرتب کیا ہے اور اس پر انھوں نے جو مقدمہ لکھا ہے وہ نہ صرف محمد قلی قطب شاہ کی شخصیت کے تمام گوشوں کا احاطہ کرتا ہے بلکہ گولکنڈہ کی تاریخ پر بھی خاطر خواہ روشنی ڈالتا ہے۔ محمد قلی قطب شاہ کی تصویر کے علاوہ حیدرآباد کی اہم عمارتوں کی تصویریں بھی کتاب میں دی گئی ہیں۔

صفحات: 823، قیمت -/175 روپے

کلیات سراج

مرتب: پروفیسر عبدالقادر سروری

سراج اورنگ آبادی کو اردو کا پہلا صوفی منش شاعر کہا جاسکتا ہے لیکن ان کی شاعری متصوفانہ کیفیات کے علاوہ بھی بہت کچھ اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے۔ ان کا یہ کلیات دکنیات کے ماہر پروفیسر عبدالقادر سروری مرحوم نے بڑی کاوش و کوشش کے ساتھ مرتب کیا ہے۔ شروع میں بسوط مقدمہ بھی ہے جس میں سراج کی شخصیت اور شاعری کے اہم پہلوؤں پر عالمانہ گفتگو کی گئی ہے۔

دوسرا ایڈیشن: صفحات: 732، قیمت :-/138 روپے

کلیات عیش

مرتب: ڈاکٹر حبیبہ بانو

حکیم آغا جان عیش دہلوی، ذوق، مومن اور غالب کے ہم عصروں میں تھے اور بہادر شاہ ظفر کے دربار میں بھی انھیں رسائی حاصل تھی۔ غالب کی مشکل پسندی پر ان کا طنزیہ قطعہ 'گر ان کا کہا یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے' مشہور ہے مگر غالب کی وفات پر انھوں نے جو تاریخی قطعہ مع اشعار لکھے ہیں، وہ غالب سے ان کی محبت و مودت کو ظاہر کرتے ہیں۔ عیش خوش فکر شاعر تھے اور انھوں نے اپنا مرتب دیوان اور کلیات اپنی زندگی ہی میں مرتب کر لیا تھا۔ ڈاکٹر حبیبہ بانو کے مرتب کردہ اس کلیات میں غزلوں کے علاوہ دوسرے اصناف سخن بھی ہیں جو عیش سے یادگار ہیں۔ مفصل مقدمے کے ساتھ۔

پہلا ایڈیشن: صفحات: 556، قیمت :-/80 روپے

گلشن بے خار

مصنف: نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ

یہ اردو شعرا کا مشہور تذکرہ ہے جو نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ نے بزبان فارسی قلمبند کیا تھا اور اس کے بعض بیانات، اس دور کے شعرا کا ذکر آئے تو آج بھی دہرائے جاتے ہیں جس سے یہ تاریخی اہمیت کا حامل تذکرہ ہو گیا ہے۔ اس اہم تذکرے کو جو حصہ میں سے شیفتہ کے زمانے تک کے ساڑھے چھ سو سے زائد شعرا اور شاعرات کے تذکرے و انتخاب اور نمونۂ کلام پر مشتمل ہے، محترمہ حمیدہ خاتون نے اصل کتاب کے متعدد نسخوں کو سامنے رکھ کر سلیس اردو میں منتقل کیا ہے اور شروع میں ایک سیر حاصل مقدمہ لکھا ہے۔

پہلا ایڈیشن: صفحات: 430، قیمت -/128 روپے

نوٹ: طلبہ کے لیے 45 فیصد اور اساتذہ کے لیے 40 فیصد کی خصوصی رعایت۔ تاجرانِ کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر.کے. پورم، نئی دہلی-110066

رضوان رضوی

بچوں کی تربیت میں اساتذہ کا کردار

تعلیم ایک ناگزیر عمل ہے کیوں کہ کسب معاش سے لے کر کسب جاہ تک تقریباً ہر انسانی خواہش تعلیم سے مدد لینے پر مجبور ہے۔ تعلیم کی ضرورت تہذیب کے ارتقا کے ہر دور میں تسلیم کی جاتی رہی ہے۔ علم ہی کی وجہ سے انسان نے اتنی ترقی کی ہے۔ علم ہی کے ذریعے انسان اس قابل ہوا ہے کہ وہ فطرت کے رازوں کو سمجھنے اور انھیں اپنے فائدے کے لیے استعمال کر سکے۔

درس گاہ مادری سے نکل کر ایک بچہ جب عام تعلیمی درس گاہ میں جاتا ہے تو ماں کے بعد سب سے زیادہ اثر اپنے استاد کا قبول کرتا ہے۔ بچے اپنے استاد کی کہی ہوئی بات کو پتھر کی لکیر سمجھتے ہیں۔ اگر کبھی استاد سے غلطی ہو جائے اور گھر میں اس غلطی کی تصحیح کی جائے تو بچے اس کو نہیں مانتے اور استاد کی بتائی ہوئی غلط بات کو ہی صحیح سمجھتے ہیں جب تک کہ استاد خود اس کی اصلاح نہ کر دے۔ اس لیے اساتذہ پر بڑی ذمے داری عائد ہوتی ہے کہ وہ اپنے کردار اور اپنی شخصیت کو ایسا نمونہ بنائیں جو بچوں کے لیے قابل تقلید ہے۔ تعلیم کے ساتھ تربیت بھی لازمی ہے۔ صرف سبق پڑھا دینا اور اس کورٹ لینا ہی کافی نہیں۔ استاد بچے کو جھوٹ بولنے سے منع کرتے ہیں اور سچ بولنا سکھاتے ہیں مگر اس کے لیے صرف کہنا ہی کافی نہیں ہوتا جب تک عملی طور پر اس کا نمونہ پیش نہ کیا جائے۔ بچے کی شخصیت کو بنانے اور بگاڑنے کی ذمے داری دراصل ابتدائی جماعتوں کے اساتذہ پر زیادہ ہوتی ہے کیوں کہ اس وقت بچہ کم عمر ہوتا ہے اور اس کا ذہن ایک سلیٹ کی مانند ہوتا ہے جس پر کچھ بھی لکھا جا سکتا ہے۔ پرائمری اسکول کا بچہ اپنے استاد کی ہر بات اپنے ذہن میں نقش کر لیتا ہے اور اس کے مطابق چلتا ہے۔ پرائمری اسکول کے بچے عمر پانچ سے دس یا بارہ سال تک کی ہوتی ہے اور یہی عمر بچے کی شخصیت کو بنانے اور بگاڑنے میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ بچے کا کورا اور معصوم ذہن ہر قول اور فعل کو آسانی سے قبول کر لیتا ہے۔ اس لیے استاد کا یہ کام ہے کہ بچے کے لیے ایسا ماحول مرتب کرے جو بچے پر اثر انداز ہو اور بچے کی رہنمائی کرے۔ اس لیے پرائمری اسکول کے اساتذۂ کرام پر یہ بڑی ذمے داری عائد ہوتی ہے کہ وہ بچوں کی شخصیت کو بنائیں اور ان میں کردار کی اعلیٰ خوبیوں کو نکھاریں۔ استاد بچوں کی شخصیت کو بنانے اور بگاڑنے میں دائمی اثر رکھتے ہیں اور ان کی ذہنی اور فطری صلاحیتوں کو ابھارنے اور ان میں خود اعتمادی پیدا کرنے میں نمایاں کردار ادا کرتے ہیں۔ اچھے استاد کو اپنے شاگردوں سے اتنی ہی محبت ہوتی ہے جیسی ان کے والدین کو ہوتی ہے۔ ایک مفکر کے قول کے مطابق ''ایک استاد اور ایک ماں یہ دو ہستیاں ایسی ہیں جو اپنے کسی بھی بچے سے کبھی مایوس نہیں ہوتیں۔'' ماں اپنی بگڑی ہوئی اولاد سے بھی کبھی مایوس نہیں ہوتی اور نہ اس کے لیے اپنے دل میں شفقت اور محبت کم کرتی ہے۔ وہ ہمیشہ اس کے راہِ راست پر آ جانے کے لیے پُر امید رہتی ہے۔ اسی طرح ایک اچھا استاد بھی اپنے نالائق اور کند ذہن طالب علموں کی ذہنی صلاحیتوں کو بیدار کرنے کی کوششوں میں لگا رہتا ہے اور اس کی طرف سے کبھی مایوس نہیں ہوتا۔

اسکول یا مدرسہ اخلاقی تہذیب اور تربیت کا گہوارہ ہوتا ہے اور اسکول کے ماحول میں استاد کی ذات کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے اسے معاشرے میں بہت عزت اور احترام حاصل ہوتا ہے ایک اچھا استاد اپنے طلبہ کے دل و دماغ پر اپنی شخصیت، اپنے فلسفۂ زندگی اور طرزِ عمل سے گہرا اثر ڈال سکتا ہے۔

استاد کئی طریقے سے طلبہ پر اپنی شخصیت کا اثر ڈالتا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ بچوں میں تقلید کا مادہ بہت زیادہ ہوتا ہے اور وہ اپنے دوستوں، بزرگوں اور استادوں کی ہر بات میں تقلید کرتے ہیں۔ ان کی بات چیت کا طریقہ، ان کا لباس، ان کی عادتیں، غرض کوئی چیز اس تقلید کے اثر سے خالی نہیں ہوتی۔ اساتذہ کو چاہیے کہ بچوں کی فطرت کی اس خصوصیت سے فائدہ اٹھائیں اور انھیں آدابِ مجلس، تہذیب، شائستگی اور اچھی معاشرتی عادتوں کی تعلیم دیں۔ اگر استاد بچوں کے سامنے اچھا نمونہ پیش کرتا ہے تو اس کے اثر سے بچوں میں اچھی عادتیں پیدا ہو سکتی ہیں۔ مثلاً لوگوں کے ساتھ اخلاق سے پیش آنا، دوسروں کی مدد کرنا۔ اپنا کام محنت اور استقلال کے ساتھ انجام دینا، وقت کی پابندی، صفائی وغیرہ۔ اگر استاد کو یہ اخلاقی اصول اور قدریں عزیز ہیں اور وہ عملی طور پر بھی ان کا اچھا نمونہ پیش کرتا ہے تو وہ بچوں کو ایک بہتر اور بلند تر معیارِ زندگی سے آشنا کر سکتا ہے اور بچوں کو اخلاقی اقدار کا مالک بنا سکتا ہے۔

استاد کی ایک اور ذمے داری یہ ہے کہ وہ اپنے علم کی حدود کی توسیع کرتا

رہے اور موزوں طریقے سے ان معلومات کو بچوں تک پہنچائے۔ استاد اس سلسلے میں جتنی زیادہ محنت کرے گا وہ اپنی ذمے داری کو اچھی طرح پوری کرے گا۔ معلومات کو بچوں تک پہنچانے کے بھی بہت سے طریقے ہیں۔ مثلاً تقریر کے ذریعے، تحریر کے ذریعے اور مختلف علمی اور ادبی مشاغل کے ذریعے۔ استاد کا کام یہ ہے کہ زیادہ موثر طریقہ استعمال کرے جو بچوں کی صلاحیتوں اور دلچسپیوں کے مطابق ہوتا کہ وہ اچھی طرح سمجھ جائیں۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ استاد کو صرف اس بات پر اکتفا نہیں کرنی چاہیے کہ معلومات بچوں تک پہنچا دے، یہ بھی ضروری ہے کہ بچوں کی علم حاصل کرنے کی صلاحیت کو فروغ دے اور ان کے اندر علم کا سچا شوق پیدا کرے۔ یہ استاد کی ذمے داری ہے کہ بچے کی مناسب دیکھ بھال کرے اور ان کی فطری نشو ونما کی راہ میں آنے والی رکاوٹوں کو دور کرے۔

ایک اچھا استاد اپنے طالب علموں کی نفسیات سے پوری طرح واقف رہتا ہے اور ان کی شخصیت کو ان کی نفسیات کے مطابق فروغ میں مثبت کردار ادا کرتا ہے۔ اچھے استاد کی یہ خوبی بھی ہوتی ہے کہ وہ بچے کی مشکلات دور کرے اور اسے الجھنوں سے نکالنے کی کوشش کرے۔ بہت سے بچے اپنے گھریلو حالات کی وجہ سے ذہنی طور پر پراگندہ رہتے ہیں جس کی وجہ سے ان کی تعلیمی سرگرمیوں پر بہت برا اثر پڑتا ہے۔ کچھ بچوں کے والدین کی آپسی چپقلش ان کے ذہن پر بہت برا اثر ڈالتی ہے جس سے ان کی ذہنی استعداد پر فرق پڑتا ہے۔ بچوں کی حوصلہ افزائی کے ذریعے استاد ان کا مستقبل بہتر بنا سکتا ہے۔ اس مقصد کے لیے والدین اور اساتذہ کے درمیان گہرا تعلق اور اشتراک عمل درکار ہوتا ہے تاکہ استاد اور والدین دونوں مل کر بچے کو ایک اچھا طالب علم اور فرماں بردار بچہ بنا سکیں۔ اس کے علاوہ خصوصی طور پر ابتدائی جماعتوں کے بچوں پر اساتذہ کی طرف سے ان کی غلطیوں پر سخت سزائیں اور جسمانی تشدد ان کی شخصیت کو بگاڑ دیتی ہے۔ بعض دفعہ تو اساتذہ کسی بھی غلطی کرنے والے بچے کی بجائے دوسرے بچے کو قصوروار ٹھہرا کر سخت سزائیں دیتے ہیں۔ ایک اچھے استاد کا فرض ہے کہ پیار اور نرمی سے اصل حقیقت معلوم کر کے جس کی غلطی ہو اس کی سرزنش ضرور کرے لیکن سنگین سزا دینے سے گریز کرے۔ اگر بچے کو ناکردہ گناہوں کی سزا ملے تو اس کی عزت نفس پر اثر پڑے گا۔ اس کے جذبات مجروح ہوں گے اور اس کی خود اعتمادی ختم ہو جائے گی۔

اساتذہ کو سوچ سمجھ کر کوئی قدم اٹھانا چاہیے اور کوشش یہ کرنی چاہیے کہ ان کے قول وفعل اور عمل سے کسی بھی بچے پر منفی اثر نہ پڑے بلکہ ان کا ہر عمل ایسا نمونہ ہو جو بچے کی صحیح کردار سازی کر سکے۔ ایسے استاد کے تربیت یافتہ طلبہ ایک اچھے معاشرے کی تشکیل میں کلیدی کردار ادا کر سکتے ہیں اور قوم و ملک کی ترقی میں معاون ثابت ہو سکتے ہیں۔

□□□

رابطہ:

Aashyana, Banaulia
Bihharsharif
Nalanda-803101

لفظ

شاعر: آل احمد سرور

پروفیسر آل احمد سرور کا شمار اردو کے دیدہ ور نقادوں میں ہوتا ہے مگر وہ ایک نغز گو شاعر بھی تھے۔ ان کی شاعری ماضی کے اکتسابات کی حامل، حال کے میلانات کی ترجمان اور مستقبل کے امکانات کی نقیب ہے۔ سرور صاحب کی زندگی میں ان کے تین شعری مجموعے "سلسبیل"، "ذوق جنوں" اور "خواب اور خلش" شائع ہوئے۔ "لفظ" ان کا آخری شعری مجموعہ ہے۔

صفحات: 95، قیمت :-/64 روپے

مقالاتِ مسعود

مصنف: مسعود حسین خاں

یہ کتاب ممتاز ماہر لسانیات پروفیسر مسعود حسین خاں کے سولہ علمی مضامین کا مجموعہ ہے جن میں اردو صوتیات، اقبال کا صوتی آہنگ، غالب کے خطوط کی لسانی اہمیت، اردو لغت نویسی کے مسائل وغیرہ مختلف موضوعات زیر بحث آئے ہیں۔

صفحات: 230، قیمت :-/18.50 روپے

نوٹ: طلبہ کے لیے 45% اور اساتذہ کے لیے 40% کی خصوصی رعایت۔ تاجرانِ کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی-110 066

تحریر: جگدیپ ایس. چھوکر
مترجم: محمد عمر رضا

تعلیم کا مقصد محض حصول معاش نہیں

عام حالات میں تعلیم کے مقاصد پر بحث کرنا ایک غیر ضروری امر ہے، کیوں کہ ہر شخص اس سے بخوبی واقف ہے لیکن موجودہ زمانہ عام حالات سے قدرے مختلف ہے۔ اسی لیے ہمیں تعلیم کے مقاصد پر از سر نو غور و فکر کرنے کی ضرورت ہے۔ خاص طور پر ایسے وقت میں جب کہ افراد اپنا مستقبل سنوارنے کی خاطر پیشہ ورانہ تربیت کی طرف رجوع کر رہے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ تعلیم کے ذریعے نظام اقدار، غلط صحیح اور اچھے برے کے درمیان امتیاز قائم کرنے کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے، ایک طرح سے یہ انسان میں فیصلہ لینے کی صلاحیت بھی پیدا کرتی ہے۔ ایک ایسا تعلیم یافتہ شخص جو معلومات عامہ، عقل سلیم اور منطقی استدلال کی طاقت رکھتا ہو، اس سے یہ ضرور توقع کی جاتی ہے کہ وہ منطقی دلائل کے ساتھ فیصلے لینے کی اہلیت رکھتا ہو۔ اس میں یہ صلاحیت بھی موجود ہوگی کہ وہ اپنے اور اپنے ملک و معاشرے کے مفاد کو سمجھ سکے۔ تعلیم کا مقصد افراد کو اچھا شہری بنانا ہے اور یہی اس کا بنیادی مقصد ہونا چاہیے۔

ہمارا تعلیمی نظام عوام کو ایک اچھا شہری بنانے میں کس حد تک معاون و مددگار ثابت ہو رہا ہے یہ ایک بحث طلب معاملہ ہے، لیکن میرا خیال ہے کہ عوام کو باخبر، ذمہ دار اور چاق و چوبند شہری بنانے میں ہمیں ابھی ایک لمبا سفر طے کرنا ہے۔ اس حقیقت کا اندازہ اس بات سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ عوام کا ایک بہت بڑا تناسب عام طور پر تعلیم یافتہ اور باخبر تسلیم کیا جاتا ہے، لیکن اس کے باوجود اسے اس بات کا قطعی علم نہیں ہوتا کہ ایک اچھا شہری ہونے کے ناطے اس کی کچھ ذمہ داریاں بھی ہیں۔ آئین میں موجود اپنے بنیادی حقوق سے تو وہ پوری طرح آگاہ ہوتا ہے لیکن ایک شہری ہونے کے ناطے آئین نے اس پر کیا ذمہ داریاں عائد کی ہیں، اس سے وہ قطعی آگاہ نہیں ہوتا۔

تعلیم کا بنیادی مقصد حاصل کرنے میں سب سے بڑی رکاوٹ یہ ہے کہ لوگ تعلیم کو محض اچھا روزگار حاصل کرنے کا ذریعہ تسلیم کرنے لگے ہیں۔

> ''اگر طلبہ شہریت کے معاملات میں خود فیصلہ نہیں لے سکتے تو کیا وہ پیشہ ورانہ معاملات میں ایسا کر سکتے ہیں؟''

جب کہ یہ بات ہمہ وقت پیش نظر رہنی چاہیے کہ ہر شخص سب سے پہلے ایک اچھا شہری ہے، اس کے بعد ہی وہ ایک پیشہ ور ہے۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جو تربیت اور تعلیم کے درمیان فرق کو ہم پر بخوبی آشکارا کرتی ہے۔ دی رینڈم ہاؤس ڈکشنری(The Random House Dictionary) میں تعلیم اور تربیت کے فرق کی وضاحت کچھ یوں کی گئی ہے: ''تعلیم'' ذہنی صلاحیتوں کی نشوونما (جاننے کا علم) کے فروغ کو کہتے ہیں۔ مثلاً آزادانہ تعلیم حاصل کرنا۔ ''تربیت'' ایک تجرباتی تعلیم (کرنے کا علم) یا مشق ہے جو عام طور پر کسی کے ماتحت حاصل کی جاتی ہے۔ تربیت خاص طور پر کسی فن، تجارت یا پیشے کے لیے ہوتی ہے۔ مثلاً فن کی تربیت اور اساتذہ کی تربیت۔

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہمارا تعلیمی نظام بالخصوص نام نہاد تعلیم کے ''ترجیحی زاویے'' پر زور دیتا ہے۔ تعلیم سے متعلق اس تنگ نظری کا نتیجہ یہ ہے کہ مختلف تعلیمی اداروں اور نام نہاد اعلیٰ تعلیمی اداروں سے فارغ ہونے والے افراد بھی معاشرے میں اپنا کردار ادا کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے اور نہ ہی وہ اس بات کے لیے راضی ہوتے ہیں۔ اس بات کا اظہار کئی سطحوں پر ہوتا ہے۔ مثلاً نامناسب تجارتی عمل اور انتظامیہ و سیاست میں نازیبا سلوک۔

اکثر یہ دلیل دی جاتی ہے کہ ہمارے ترقی پذیر ملک میں جہاں کی آبادی بہت زیادہ ہے، غریبی اور بے روزگاری بھی حد درجہ ہے اس لیے روزگار حاصل کرنا یہاں کی سب سے پہلی ضرورت ہے۔ نام نہاد اچھی شہریت تو عوام اپنی زندگی کے تجربات سے خود ہی سیکھ سکتے ہیں۔ مزید یہ کہ طلبا میں اچھی شہریت کے اقدار ذہن نشیں کرانے کی بات کی جاتی ہے تو اساتذہ با اثر سماج مخالف طاقتوں کا حوالہ دیتے ہوئے اپنی بے بسی کا اظہار کرتے ہیں۔ جب کہ میرا خیال ہے کہ ہر وہ شخص جو تعلیم دینے کے کام میں مصروف ہے (ہمیں یہ بات ملحوظ خاطر رکھنی چاہیے کہ تعلیم محض اساتذہ سے ہی حاصل نہیں کی جاتی بلکہ اس کے مختلف ذرائع ہوتے ہیں۔)، اس کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ ایسے نظام

اقدار کے خلاف طلبا میں سوال اٹھانے کی حوصلہ افزائی کریں جس سے ساجی بہتری میں کوئی خلل واقع ہوتا ہے۔

ایک اچھا انسان بنے بغیر ایک اچھا شہری بننا بہت ہی مشکل امر ہے۔ اس لیے طلبا کو روزگار حاصل کرنے کا اہل بنانے کے علاوہ تعلیم کا مقصد یہ بھی ہونا چاہیے کہ انھیں اچھے انسانی اقدار کا متحمل بنایا جائے کہ زیادہ تر طلبا کا نام نہاد "پیشہ ورانہ کورسیز" کو ترجیح دینے کے سبب انسانیات (Humanities) اور ساجیات (Social Science) کو دی گئی اہمیت میں تخفیف کرنا یا اسے نظر انداز کرنا، بڑی تشویش ناک بات ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ تعلیم کو ہر سطح پر طلبا کو ایک اچھا انسان اور ایک اچھا شہری بننے میں اس کی مدد کرنی چاہیے اور اس ضمن میں اس کی بھرپور حوصلہ افزائی ہونی چاہیے۔ یہ ایسی باتیں ہیں جن پر خصوصی توجہ دینے کی ضرورت ہے، کیوں کہ یہ تعلیم کے سب سے بنیادی مقاصد ہیں۔

تعلیم کے پیشے سے وابستہ ہم جیسے لوگ ساج کو سخت خطرے میں ڈال کر ہی ان باتوں کو نظر انداز کرسکتے ہیں۔ ساج کی حالیہ تبدیلیوں بشمول بنیادی تعلیم کو تقریباً پورے طور پر نظر انداز کرتے ہوئے نام نہاد "اعلیٰ تعلیم" پر حد سے زیادہ زور دنیا ملک کے لیے نیک فال نہیں ہے۔ ہمیں مارک ٹوائن (Mark Twain) کے نقش قدم پر ہمیشہ چلنے کی ضرورت ہے جس نے ایک دفعہ کہا تھا کہ "میں اپنی تعلیمی زندگی میں ان اصولوں پر ہمیشہ قائم رہا جو مجھے اسکول میں سکھائے گئے تھے۔"

(بشکریہ انڈین ایکسپریس، 27 جون 2006)

□□□

حالی

مصنف: صالحہ عابد حسین

ایک شاعر، ادیب، نقاد، سوانح نگار کے ساتھ ساتھ مولانا الطاف حسین حالی ایک ساجی مصلح بھی تھے۔ انھوں نے نہ صرف مسلمانوں کی اصلاح کے لیے شاعری کا سہارا لیا بلکہ شعر و ادب کی کمزوریوں کی بھی نشان دہی کی اور اچھے اور معیاری ادب کی تخلیق کی ترغیب دی۔ صالحہ عابد حسین نے حالی کی شخصیت اور زندگی کے تمام گوشے اس کتاب میں اجاگر کیے ہیں۔

صفحات: 68، قیمت: -/15 روپے

محمد حسین آزاد

مصنف: نند کشور وکرم

محمد حسین آزاد ہمارے ان اکابرین میں سے ہیں جنھوں نے اردو کی ادبی تاریخ کا رخ موڑنے میں اہم رول ادا کیا۔ انجمن پنجاب کے ذریعے انھوں نے جدید نظم کو فروغ دینے کے ساتھ آب حیات، دربار اکبری، نیرنگ خیال اور سخندان فارس جیسی اہم کتابیں بھی لکھیں۔ نند کشور وکرم نے اس کتاب میں آزاد کا بھرپور تعارف کرایا ہے۔

صفحات: 79، قیمت: -/18 روپے

اقبال کی کہانی

مصنف: جگن ناتھ آزاد

اقبال وہ عظیم شاعر اور فلسفی ہے جسے عالمی ادب کے منظرنامے میں اہم مقام حاصل ہے۔ شاعر اور فلسفی ہونے کے ساتھ ساتھ وہ شگفتہ مزاج انسان بھی تھے۔ ان کی علمی اور ادبی بحثوں سے بڑے باریک نکتے، اسرار اور لطیفوں کے چمن زار کھلتے تھے۔ اقبال کو اپنے ملک وقوم کے بچوں کے مستقبل سے والہانہ لگاؤ ہی تھا جس کے سبب انھوں نے بچوں کے لیے مضامین لکھے اور خوب صورت نظمیں کہیں جنھیں پڑھ کر بچے اچھے شہری بن سکتے ہیں۔ ماہر اقبالیات جگن ناتھ آزاد نے اس کتاب میں اقبال کا جامع تعارف کرایا ہے۔

صفحات: 83، قیمت: -/11 روپے

جوش ملیح آبادی: شخصیت اور فن

مصنف: ظفر محمود

جوش ملیح آبادی اردو شعر و ادب کا ایک اہم نام ہے۔ انھوں نے نہ صرف شاعری کو خوب صورت زبان عطا کی بلکہ نثر میں بھی گل کاری کی ہے۔ ان کے شعر و ادب کے مطالعے سے خود اعتمادی، جوش اور اپنے ملک وتہذیب کی بقا کے لیے سینہ سپر ہونے کا پیغام ملتا ہے۔ نہ صرف ان کا فن بلکہ خود شاعر کی زندگی کے حالات اس پیغام کی بہترین ترجمانی کرتے ہیں۔ ظفر محمود نے "جوش ملیح آبادی: شخصیت اور فن" میں شاعر کی زندگی اور فن کے انھی گوشوں کو اجاگر کیا ہے جن سے نئی نسل کی ذہنی وملی تربیت ہوتی ہے۔

صفحات: 105، قیمت: -/38 روپے

نوٹ: طلبہ کے لیے 45 فیصد اور اساتذہ کے لیے 40 فیصد کی خصوصی رعایت۔ تاجرانِ کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر.کے. پورم، نئی دہلی-110066

زبیر احمد بھاگلپوری

بہار قانون سازیہ میں اردو کی حیثیت

یوں تو بہار میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ 82-1981 میں ہی حاصل ہو گیا تھا لیکن بہار قانون سازیہ میں اس کا نفاذ بتدریج ہوا۔ بہار میں اردو کے قانونی سرکاری زبان کے اعلان و استعمال کے پیش نظر قانون ساز کونسل میں 24 اپریل 1995 کو 'اردو شعبہ' کے قیام کی تمام دفتری کارروائیاں مکمل کرتے ہوئے 27 اپریل 1995 کو بہار پبلک سروس کمیشن کو تمام گزیٹیڈ اور نن گزیٹیڈ عہدوں پر تقرری کے لیے ضروری کارروائی کی ہدایت دی گئی۔ یہ ہدایت کونسل سکریٹریٹ (شرائط برائے بحالی و ملازمت) دستور، 1965 کی شق۔3 کے دوسرے پیراگراف کے تحت حاصل اختیارات کے ضمن میں دی گئی۔ 1995 سے ہی پہلی بار کونسل کے اجلاس کے دوران روزمرہ کے کاموں میں اردو کے استعمال کی جو لازمی صورتیں تھیں، ان پر بھی عمل شروع ہوا۔ دوران اجلاس 'روزانہ تفصیلات'، 'توجہ طلب اطلاع' اور 'فہرست امور' وغیرہ بھی بالکل اسی طرح اردو میں تیار کر کے اراکین کونسل اور متعلقہ وزرا تک وقت پر پہنچائے جانے لگے، جس طرح ہندی میں پہنچائے جاتے ہیں۔

اسے بہار قانون ساز کونسل کے سابق چیئرمین جابر حسین کی اردو کے تئیں سچی محبت کا نتیجہ ہی کہا جائے گا کہ انھوں نے اردو کو آئینی حیثیت ملنے سے قبل ہی کونسل میں اردو شعبہ قائم کر کے اردو کا کام شروع کر دیا۔ واضح ہو کہ 'اردو شعبہ' کے قیام کی کارروائی انھوں نے 24 اپریل 1995 کو ہی پوری کر لی تھی جب کہ انھوں نے اسے کونسل کی زبان کا درجہ دینے کی سمت میں 26 دسمبر 1995 کو پیش قدمی کی جب نوٹیفکیشن نمبر (1)2814-32/95 کے ذریعے بہار قانون ساز کونسل کے ضابطہ نامہ، طریقۂ کار اور دستور العمل کے ضابطہ (4)273 کے تحت قانون ساز کونسل کے ضابطہ نامہ، طریقۂ کار اور دستور العمل کے ضابطہ۔ 41 میں ترمیم کیا گیا۔ اس کے تحت ضابطہ۔ 41 کی پہلی سطر میں لفظ ''دیوناگری'' کے بعد' اور اردو زبان و رسم الخط'' کا اضافہ ہوا اور اسی ضابطے کے پہلے حصے کی پہلی سطر میں لفظ ''ہندی'' کے بعد' یا اردو زبان'' کا اضافہ ہوا۔

اس ترمیم کے بعد اب کونسل کا سارا کام ہندی زبان (دیوناگری رسم الخط) اور اردو زبان اور رسم الخط میں انجام پا رہا ہے۔ اس ترمیم کے ذریعے اردو کو فارسی رسم الخط کے طور پر درج کرنے کی بجائے اردو رسم الخط کر دینے سے اردو کی آئینی شناخت کو تقویت ملی ہے۔

''بہار گزٹ'' کی اشاعت ہندی کے ساتھ ساتھ اردو زبان میں بھی پہلی بار 30 دسمبر 1995 کو ہوئی۔ اس شمارے میں اردو زبان اور رسم الخط کو کونسل کی زبان کی حیثیت سے منظوری دیے جانے کے متعلق ضابطے شائع کیے گئے۔ ایسا نہیں ہے کہ ''بہار گزٹ'' میں اردو کے متعلق ضابطے سیدھے سیدھے شامل کر دیے گئے۔ اس عمل سے قبل دستور العمل کمیٹی کے ذریعے اردو سے متعلق ضابطہ۔ 41 میں منظور ترمیم کی تجویز پر 19 دسمبر 1995 کو باضابطہ ایوان میں بحث ہوئی۔ بحث میں مذکورہ ترمیم کو منظور کرنے کے بعد ہی اسے ''بہار گزٹ'' میں شامل کیا گیا۔ اس طرح قانون ساز کونسل میں اردو کو نہ صرف کونسل سکریٹریٹ بلکہ کونسل ایوان کی زبان کا درجہ بھی حاصل ہے۔

بہار قانون ساز اسمبلی میں اردو کو ایوان کی زبان کا درجہ آئینی طور پر حاصل نہیں ہے۔ 1992 اور 1994 کے ضابطہ نامہ، طریقۂ کار اور دستور العمل کے صفحہ نمبر۔ 18 اور 14 کے مطابق ایوان کی زبان ہندی ہے۔ صرف بولنے کی حد تک اردو زبان کی اجازت دی گئی ہے اور کارروائی بدستور ہندی (دیوناگری رسم الخط) میں ہی لکھنے کا نظم ہے۔ یہی باتیں 2002 میں شائع دستور العمل میں بھی درج ہیں۔ اس میں اردو رسم الخط کا کوئی ذکر نہیں ہے۔

دستور العمل کے متعلقہ ضابطے درج ذیل ہیں:

''اسمبلی کا کام ہندی زبان، دیوناگری رسم الخط میں انجام پذیر ہوگا۔

لیکن اگر کوئی رکن سنسکرت میں صرف حلف لینا چاہیں تو وہ ایسا کر سکیں گے،

لیکن کوئی رکن اگر اردو میں بھی تحریری اطلاع دینا چاہیں، تو دے سکتے ہیں اور اپنے خیالات کا اظہار ایوان میں کر سکتے ہیں۔

لیکن جو رکن ہندی یا اردو میں اپنے خیالات کا اظہار واضح طور پر نہیں کر سکتے ہوں، انھیں اسپیکر ایوان میں اپنی مادری زبان میں بولنے کی اجازت دے سکیں گے۔

لہٰذا، اگر کسی رکن کو ایوان میں اپنی مادری زبان (ہندی یا اردو چھوڑ کر) میں بولنے کی اجازت دی جاتی ہے تو وہ اپنے بیان کے دیوناگری رسم الخط میں تحریری ترجمے کو ایوان کی کارروائی میں شامل کرنے کے لیے سکریٹری کو پیش

کریں گے۔"

لیکن اس کے برعکس بہار قانون ساز کونسل کے ضابطہ نامہ، طریقۂ کار اور دستورالعمل میں، جیسا کہ مندرجہ بالا سطور میں ذکر ہوا، واضح طور پر یہ بات شامل ہے کہ کونسل کا کام ہندی کے ساتھ ساتھ اردو زبان اور رسم الخط میں ہوگا۔ اس سلسلے میں دستورالعمل کے ضابطہ۔ 41 کے تحت کونسل کی جو زبان ہوگی، وہ یوں ہے۔

"کونسل کا کام ہندی زبان اور دیوناگری رسم الخط اور اردو زبان اور رسم الخط میں ہوگا۔لیکن چیئرمین کسی رکن کو، جو ہندی یا اردو زبان میں اپنے خیالات کا پوری طرح اظہار نہیں کر سکتے، اپنی مادری زبان میں کونسل میں بولنے کی اجازت دے سکتے ہیں۔"

اسی ضابطے کے تحت نوٹ میں یہ بھی درج ہے کہ ایوان کی کارروائی، کمیٹیوں کی رپورٹ وغیرہ تمام کام ہندی زبان/دیوناگری رسم الخط کے ساتھ ساتھ اردو زبان و رسم الخط میں بھی انجام پذیر ہوں گے۔ جنھیں مرحلہ وار طریقے سے عمل میں لانے کا اختیار چیئرمین، بہار قانون ساز کونسل کو ہوگا۔

اس طرح واضح ہے کہ قانون ساز کا کونسل میں اردو زبان کی آئینی حیثیت جتنی مستحکم ہے، اتنی اسمبلی میں نہیں ہے۔ تاہم سابق اسپیکر مرحوم غلام سرور نے اپنے اختیارات کا استعمال کرتے ہوئے وہاں بھی "اردو شعبہ" قائم کیا تھا جو آج بھی قائم ہے اور وہاں بھی 'روزانہ تفصیلات' توجہ طلب اطلاع، سمن، اور فہرست امور وغیرہ اجلاس کے دوران اردو میں بھی شائع ہوتے ہیں درجنوں اردو عملے وہاں بھی 'اردو شعبہ' میں بطور سرکاری ملازم کام کر رہے ہیں۔ پچھلے دنوں ششماہی مجلّہ "ترجمان اسمبلی" کا اجرا ہوا جس میں اسمبلی کے داخلی امور کے علاوہ عام ادبی اردو مضامین و مقالے شائع ہوں گے۔ بہار قانون ساز کونسل میں دوران اجلاس ہونے والے کام کے علاوہ پہلے سے ہی ایک مختصر رسالہ "خبرنامہ" کے نام سے اور ایک ضخیم رسالہ "دستاویز" کے نام سے شائع ہو رہا ہے۔ یہ رسالے یوں تو مختلف النوع مضامین پر مشتمل ہوتے ہیں لیکن ان میں اقلیتی مسائل کو خصوصی اہمیت کے ساتھ شائع کیا جاتا ہے۔

اردو کے ارتقائی سفر کے حوالے سے یہاں یہ بتانا نامناسب نہ ہوگا کہ ہندوستان کی ریاستی قانون سازیہ کے تحت ایوان زیریں میں سب سے پہلے بہار قانون ساز اسمبلی میں اردو شعبہ قائم ہوا اور ایوان بالا میں سب سے پہلے بہار قانون ساز کونسل میں اردو شعبے کا قیام عمل میں آیا۔ امید ہے کہ اس سے تحریک پا کر دیگر ریاستی قانون ساز اداروں میں بھی اردو شعبے قائم ہوں گے۔

□□□

رابطہ:
Urdu Section
Bihar Legislative Council
Patna-15

دل کی گیتا

مدوّن: مخمور سعیدی

"شریمد بھگوت گیتا" ہندستان کا وہ الہامی صحیفہ ہے جس کے ترجمے دنیا کی کئی زبانوں میں ہوئے ہیں۔ اردو میں بھی اس کے تراجم ہوتے رہے ہیں لیکن خواجہ دل محمد کا یہ ترجمہ گیتا کا بہترین ترجمہ ہے جو اردو نظم میں کیا گیا ہے۔ ترجمے میں بہت سے مقامات پر کثیر المعانی الفاظ آئے ہیں، خواجہ صاحب نے ایسے تمام مقامات پر حاشیے میں وہ معنی درج کر دیے ہیں جو وہاں مطلوب ہیں۔ جہاں جہاں ضروری سمجھا ہے حواشی میں مطالب کی تفسیر و توضیح بھی کرتے گئے ہیں۔

صفحات: 240، قیمت: -/92 روپے

خواجہ میر درد

مصنف: ظہیر احمد صدیقی

خواجہ میر درد اردو کے سب سے بڑے صوفی شاعر تسلیم کیے جاتے ہیں۔ حالانکہ ان کے کلام میں تصوف کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے۔ اس کتاب میں درد کے حالات زندگی، ان کی تصانیف، شاعرانہ خصوصیات کے ساتھ ساتھ تصوف پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ نوآموز طلبہ کے لیے ایک بہترین کتاب۔

صفحات: 64، قیمت: 14 روپے

نوٹ: طلبہ کے لیے %45 اور اساتذہ کے لیے %40 کی خصوصی رعایت۔ تاجرانِ کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر۔کے پورم، نئی دہلی۔ 066 110

عمران لاری

ان پیج — اردو پبلشنگ کی بنیادی ضرورت

موجودہ دور میں زندگی کا شاید ہی کوئی ایسا شعبہ ہو، جہاں مائیکرو کمپیوٹر کا استعمال نہ ہو رہا ہو۔ یہی صورت حال اشاعت کے شعبے میں بھی ہے۔ پہلے صرف تصاویر کی اسکیچنگ اور ڈیزائننگ کے لیے کمپیوٹر کا استعمال کیا جاتا تھا، لیکن گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ اس میں تبدیلی آتی گئی اور مواد کی تیاری سے لے کر پیج میکنگ بھی اس مشین کے ذریعے ہونے لگی اور مینول پیسٹنگ کی جگہ کمپیوٹر سے ہی پورے صفحہ کی تیاری ہونے لگی۔ کمپیوٹر بنیادی طور پر انگریزی زبان میں کام کرتا ہے، لیکن اس کی افادیت کو دیکھتے ہوئے ایسے سافٹ ویئر بنائے جانے لگے، جن کی مدد سے اردو کتب و رسائل کی اشاعت میں بھی اس سے استفادہ کیا جا سکے۔ اس مقصد کے لیے بہت سے سافٹ ویئر تیار کیے گئے، جن میں اردو لیڈ میکر، شاہکار، کاتب، صدف اردو پبلشر، اردو کلپ آرٹ اور نوری نستعلیق وغیرہ شامل ہیں۔ ان میں نوری نستعلیق کو بہت بہتر سمجھا جاتا تھا اور یہی وجہ ہے کہ اس کا استعمال بہت جلد اردو اخبارات اور دیگر جرائد میں ہونے لگا، تاہم مذکورہ سافٹ ویئر مکمل پیج میکنگ کے لیے ناکافی تھا اور اس پر زیادہ تر کام مواد کی تیاری کا ہی ہوتا تھا۔ دوسری طرف انگریزی میں بہت سے ایسے سافٹ ویئر آ چکے تھے، جن کی مدد سے پورے صفحے کی تیاری ممکن تھی۔ اسی بات کو مدنظر رکھتے ہوئے اس چیز کی ضرورت محسوس کی جانے لگی کہ کوئی ایسا سافٹ ویئر بنایا جائے، جو انگریزی کی طرح مکمل طور پر اردو پیج میکنگ کے لیے استعمال کیا جا سکے۔ کچھ عرصہ بعد ''کونسپٹ سافٹ'' کو اس میں کامیابی ہوئی اور اس نے ''ان پیج'' نامی سافٹ ویئر تیار کیا، جو مکمل طور پر اشاعتی امور کے لیے مختص تھا۔ اس کی مدد سے کسی بھی اخبار یا جریدے کا مکمل صفحہ تیار کیا جا سکتا تھا۔ اس کی افادیت کو دیکھتے ہوئے تمام اشاعتی اداروں نے ان پیج کا استعمال شروع کیا اور یوں یہ اردو پیج میکنگ کا سب سے اہم سافٹ ویئر تصور کیا جانے لگا۔ اس کامیابی کو دیکھتے ہوئے کونسپٹ سافٹ نے ان پیج کا نیا ورژن 1.1 متعارف کروایا اور اس کے بعد جلد ہی 1.2 بھی بازار میں موجود تھا۔ آج ان پیج کا جو ورژن قابل استعمال ہے، وہ ''ان پیج 2000'' کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اس میں گرافکس کے ساتھ ساتھ سرخیاں بنانے اور لے آؤٹ ڈیزائن کرنے کی بھی سہولت موجود ہے۔ اس کی دوسری اہم بات یہ ہے کہ اس کو تصاویر کے لیے فوٹو شاپ اور سرخیاں بنانے کے لیے کورل ڈرا کے ساتھ بھی استعمال کیا جا سکتا ہے اور اب یہ صورت حال ہے کہ اردو اشاعتوں میں بھی مواد کی تیاری سے لے کر لے آؤٹ ڈیزائننگ تک ہر کام مائکرو کمپیوٹر کے ذریعے ہی کیا جاتا ہے۔ یعنی جو کام پہلے صرف انگریزی اشاعت تک محدود تھا، اب وہ اردو میں بھی اپنی جگہ بنا چکا ہے۔ اس سے پہلے جتنے بھی اخبارات اور جرائد شائع ہوتے تھے، وہ سب افرادی قوت کے سہارے نکلتے تھے۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ پہلے کاتب، تحریری مواد کی کتابت کرتا تھا۔ پھر اس مواد کی ایک، ایک سطر کو کاٹ کر جگہ کی مناسبت سے سطر پر چپکایا جاتا۔ پھر پلیٹ بنتی اور یہ پلیٹ پریس میں جاتی، جہاں سے اخبار چھپ کر قارئین کے ہاتھوں میں پہنچتا۔ اب ہمارے پاس ان پیج کی صورت میں اردو پیج میکنگ کی جدید سہولت موجود ہے، جس کی مدد سے کتب و رسائل، اخبارات اور دیگر جرائد کی ڈیزائننگ، مواد کی تیاری اور اشاعت کا کام بہت بہتر طریقے سے کیا جاتا ہے۔ یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ اردو کی بہ نسبت عربی زبان میں تھوڑی بہت آسانیاں ہیں۔ عربی نظام تحریر میں حروف کو جوڑوں کی صورت میں استعمال کیا گیا اور کئی ممالک میں کمپیوٹر سے اسی طرز تحریر کا رواج عام ہوا۔ عربی میں کمپیوٹر کے اندر نسخ طرز تحریر استعمال کیا گیا، لیکن اردو میں نستعلیق طرز تحریر استعمال ہوتا ہے اور ساتھ ہی یہ بات بھی غور طلب ہے کہ بہت سے اردو کے الفاظ عربی میں موجود نہیں ہیں۔ جب کمپیوٹر کے ذریعے عربی لکھنے کا رواج عام ہونے لگا تو اسی طریقے سے اردو لکھنے کی ضرورت کے حوالے سے بھی سنجیدگی سے سوچا جانے لگا۔ بالآخر ایک غیر ملکی سافٹ ویئر بنانے والے ادارے نے اس میدان میں قدم رکھا اور بڑی محنت کے بعد اردو کا پہلا سافٹ ویئر منظر عام پر آیا۔ یہ سافٹ ویئر اشاعت کی دنیا میں ایک نیا سنگِ میل ثابت ہوا۔ اس نے بارش کے پہلے قطرے کا کام کیا اور

اس کے بعد پے در پے اردو سافٹ ویئر متعارف ہونے لگے، مثلاً خطاط، سرخاب، گلوبل، پاور پیج، صدف، اردو لیڈ میکر، ہالہ اور ورڈ پرفیکٹ 5.01 وغیرہ۔ ان سافٹ ویئروں میں ایک قدر مشترک یہ تھی کہ یہ ڈاس آپریٹنگ سسٹم میں کام کرتے تھے اور یہ صرف لیزر پرنٹر سے ہی پرنٹ نکالنے کی سہولت فراہم کرتے تھے، لیکن جب ''کاتب'' نامی سافٹ ویئر متعارف ہوا تو اس میں دو خصوصیات کا اضافہ کیا گیا ایک تو یہ ڈاٹ میٹرکس پرنٹر کو سپورٹ کرتا تھا، دوسرے اس میں ڈاس ہی میں نستعلیق طرز تحریر استعمال کرنے کی سہولت موجود تھی۔

• اردو ورڈ پروسیسنگ کے آغاز کے ساتھ ہی کمپیوٹر کی دنیا میں ایک نئے دور کا آغاز ہو گیا۔ اسی دوران نقاش نامی سافٹ ویئر تیار ہوا، جو کہ مائیکرو سافٹ کے ورڈ سے ملتا جلتا تھا لیکن ایک اچھا سافٹ ویئر ہونے کے باوجود بھی اس میں بہت سی خامیاں پائی گئیں جن پر قابو پانا ضروری تھا۔ اس لیے مذکورہ سافٹ ویئر کو اتنی مقبولیت حاصل نہ ہوسکی۔ ان خامیوں کو مدنظر رکھتے ہوئے ''ان پیج'' تیار کیا گیا۔ اس میں ان تمام خامیوں کو دور کیا گیا جو اس سے پہلے کے دیگر اردو سافٹ ویئروں میں موجود تھیں اور یہ سافٹ ویئر آج کی اردو پبلشنگ کی بنیاد ہے۔

یوں تو اس وقت بازار میں اردو کمپوزنگ اور پبلشنگ کے حوالے سے کئی سافٹ ویئر دستیاب ہیں، لیکن ان میں سب سے بہترین اور سب سے زیادہ استعمال ہونے والا سافٹ ویئر ان پیج ہی ہے۔ یہ اپنی خصوصیات کی وجہ سے تقریباً ہر پبلشنگ ہاؤس میں استعمال ہو رہا ہے۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ یہ ونڈوز آپریٹنگ سسٹم میں کام کرتا ہے۔ اسی لیے یہ گرافکس کو بھی بہت بہتر انداز سے سپورٹ کرتا ہے۔ اس کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس پر تیار کیے گئے مواد کو کورل ڈرا میں لے جا کر سرخیوں کی بہتر ڈیزائننگ کی جاسکتی ہے، ساتھ ہی تصاویر کے بہتر معیار کے لیے اس کے ساتھ فوٹو شاپ بھی استعمال کیا جاسکتا ہے۔ ان پیج صفحے کی ڈیزائننگ کے لیے دس سے زیادہ ٹولز فراہم کرتا ہے۔ ان پیج 2000 میں پہلے کی بہ نسبت زیادہ معیاری فونٹس بھی فراہم کیے گئے ہیں جن کی تعداد تقریباً 45 ہے۔

ان پیج کا کی بورڈ ڈیفائن ہے، یعنی تیزی سے ٹائپنگ کے لیے آپ اپنی مرضی کا کی بورڈ بنا سکتے ہیں۔ ساتھ ہی اس میں اعراب لگانے کی سہولت بھی موجود ہے۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ ان پیج سے صرف اردو ہی نہیں بلکہ اس کے ذریعے انگریزی، عربی، سندھی، فارسی اور پشتو میں بھی کمپوزنگ کی جاسکتی ہے۔ یوزر ڈیفائن کی بورڈ کے ساتھ اس کے ڈیفالٹ میں بھی مختلف ''کی بورڈ'' موجود ہیں، تاکہ جو لوگ اس سے پہلے اردو سافٹ ویئر استعمال کر رہے تھے وہ انھی کے اعتبار سے ''کی بورڈ'' منتخب کریں تاکہ انھیں کام کے دوران مشکل درپیش نہ آئے۔ نئے استعمال کرنے والوں کے لیے ''فونیٹک'' کی بورڈ سب سے بہتر سمجھا جاتا ہے، کیوں کہ اس کو انگریزی حروف کی آواز کی بنیاد پر بنایا گیا ہے۔ کتب وغیرہ کی تیاری کے لیے اس میں ماسٹر پیج کی سہولت فراہم کی گئی ہے (تاکہ ماسٹر پیج کی سیٹنگ ہر صفحہ پر خودکار طریقے سے منتقل ہو جائے، اس کی مدد سے آپ تحریر اور صفحات پر مختلف طرح کے بارڈر بھی لگا سکتے ہیں۔)

انگریزی ورڈ پروسیسر کی طرح اس میں بھی الفاظ کو بولڈ، اٹالک یا Reverse کر سکتے ہیں۔ ان پیج 2000 میں اخبار کا مسطر بنانا بھی بہت آسان ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج کل اخباری صنعت میں سب سے زیادہ ان پیج کا استعمال ہو رہا ہے۔ مذکورہ سافٹ ویئر کے پرانے ورژن میں فائل کھولنے کا طریقہ روایتی تھا جب کہ نئے ورژن میں گرافیکل ماحول مہیا کیا گیا ہے جس کی بدولت فائل کو بہ آسانی کٹ، کاپی، پیسٹ یا ڈیلیٹ کیا جاسکتا ہے۔

ان پیج 2000 میں آپ Utilities کے آپشن کی مدد سے کل الفاظ کی تعداد، لائنوں کی تعداد، حروف کی تعداد، پیراگراف کی تعداد، معلوم کر سکتے ہیں۔ مکمل پبلشنگ سافٹ ویئر ہونے کی وجہ سے ڈاکومنٹ تصاویر بھی شامل کی جاسکتی ہیں۔ اگر کوئی ڈاکومنٹ کوئی آپ کو لوڈ کرنا ہو تو اس کو GIF یا JPG فارمیٹ میں تبدیل کیا جاسکتا ہے۔

اگر آپ کو ڈاکومنٹ میں کوئی مخصوص لفظ تلاش کرنا ہو تو اس کے لیے سرچ کا آپشن مددگار ثابت ہوتا ہے، جو ایک جیسے الفاظ کی تبدیلی کے لیے بہت کارآمد آپشن ہے۔ اگر آپ پوری فائل میں کسی مخصوص جگہ پر تبدیلی کرنا چاہتے ہیں تو اس کے لیے بھی اس سافٹ ویئر میں آپشن موجود ہے۔ اس کے علاوہ ان پیج ہر وہ سہولت فراہم کرتا ہے جو کتب، رسائل یا اخبارات کی اشاعت کے لیے ضروری ہے۔

(بشکریہ روزنامہ ''ندیم'' بھوپال، 26 اگست 2008)

□□□

اظہار اثر

کششِ ثقل کیا ہے؟

یہ مضمون پڑھنے سے پہلے آپ ایک چھوٹا سا دلچسپ تجربہ کر کے دیکھیے۔ اس تجربے سے آپ کو کششِ ثقل یعنی گریوٹی (Gravity) کو سمجھنے میں بہت مدد ملے گی۔ تجربہ اس طرح کیجیے!!

پہلے آپ ایک کرسی پر اس طرح سیدھے بیٹھ جایئے جیسے آپ کے سامنے کیمرہ رکھا ہو اور آپ فوٹو کھنچوا رہے ہوں۔ کرسی پر بیٹھنے کے بعد ٹانگیں بالکل سیدھی کر کے زمین پر رکھ لیجیے اور دونوں ہاتھ اپنی رانوں پر رکھ لیجیے۔ آپ کی کمر بھی آگے یا پیچھے کی طرف جھکی ہوئی نہ ہو بلکہ بالکل سیدھی ہو۔ اب آپ کرسی سے اٹھ کر سیدھے کھڑے ہونے کی کوشش کیجیے۔ شرط یہ ہوگی کہ آپ ہاتھوں سے کرسی کو پکڑ کر یا گھٹنوں کو پکڑ کر اٹھنے کی کوشش نہیں کریں گے، نہ ہی اٹھتے ہوئے اپنی ٹانگیں کرسی کے اندر کی طرف موڑیں گے اور نہ ہی جسم کو ایک جھٹکا دے کر اٹھنے کی کوشش کریں گے کیونکہ جھٹکا دیتے ہوئے آپ کا جسم خود بخود آگے یا پیچھے کی طرف مڑ جائے گا۔ بس آپ جس حالت میں بیٹھے ہیں اسی حالت میں اٹھنے کی کوشش کیجیے۔ ہم یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ آپ نے ہماری ہدایات کی پابندی کرتے ہوئے کرسی سے اٹھ کر کھڑے ہونے کی کوشش کی تو آپ کبھی کھڑے نہ ہو سکیں گے کیونکہ جب تک پیروں کو کرسی کے اندر کی طرف لے جا کر یا کرسی کے دستے پکڑ کر نہ اٹھیں گے، آپ اٹھ نہیں سکیں گے۔

اس تجربے کے بعد آپ سوال کر سکتے ہیں کہ ایسا کیوں ہوتا ہے تو اس سوال کا جواب یہ ہے کہ زمین کی کشش آپ کے جسم کو اٹھنے سے روکتی ہے کیونکہ اس وقت آپ کے پاؤں مرکزِ کشش کی سیدھ میں نہیں ہوتے اور وہ مرکزِ کشش آپ کی کرسی کے نیچے اندر کی طرف ہے۔ جب آپ دونوں پاؤں کرسی کے اندر کی طرف لے جائیں گے تو وہ مرکزِ کشش کی سیدھ میں آ جائیں گے اور آپ آسانی سے کھڑے ہو جائیں گے۔ اسی طرح اگر آپ آگے کی طرف جھک کر اٹھیں گے تو آپ مرکزِ کشش کی سیدھ میں آ جائیں گے۔

اس چھوٹے سے تجربے سے آپ کو یہ پتہ چل جائے گا کہ زمین میں کس قدر زیادہ قوت کشش ہوتی ہے یہی وجہ ہے کہ ہم پوری طاقت سے چھلانگ لگانے کے باوجود زمین پر واپس آ جاتے ہیں۔ آپ کسی گیند کو کتنی قوت کے ساتھ آسمان کی طرف اُچھال دیجیے، زمین کی کشش گیند کو بھی اور چھلانگ لگانے والے کو بھی واپس زمین پر کھینچ لے گی۔

کششِ ثقل سے متعلق ایک واقعہ بہت مشہور ہے کہ اسحاق نیوٹن نامی ایک سائنس داں ایک روز ایک سیب کے درخت کے نیچے بیٹھا کچھ سوچ رہا تھا کہ درخت سے ایک سیب ٹوٹ کر اس کے سامنے گرا۔ اچانک اس کے ذہن میں ایک سوال اٹھا کہ یہ سیب شاخ سے ٹوٹ کر زمین پر ہی کیوں گرا۔ آسمان کی طرف کیوں نہیں گیا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ زمین میں کسی طرح کی کشش ہے جو ہر چیز کو اپنی طرف کھینچ لیتی ہے۔ اسحاق نیوٹن برطانیہ میں 1642 میں پیدا ہوا تھا اور 1727 میں انتقال ہوا۔ نیوٹن ان چند سائنس دانوں میں سے ایک ہے جن کے کارناموں اور کاموں کے بغیر سائنس کی تاریخ ادھوری رہ جاتی۔ نیوٹن نے فطرت کو سمجھ کر تین بنیادی قوانینِ فطرت کی طرف اشارہ کیا جن کو دنیا کے تمام سائنس داں مانتے ہیں۔ نیوٹن کے مطابق فطرت کے یہ تین قانون مندرجہ ذیل ہیں:

1. انرشیا (inertia): اس قانون کے مطابق خلا میں کوئی ہلکا یا بھاری جسم انرشیا کی حالت میں رہتا ہے یعنی اگر وہ خلا میں ایک جگہ ٹھہرا ہوا ہے تو ہمیشہ اسی حالت میں رہے گا اور اگر کوئی شے قوت استعمال کر کے اس کو کسی بھی سمت میں دھکا دے دے تو وہ جسم ہمیشہ اسی طرف اور اسی رفتار سے چلتا رہے گا جس قوت سے اس کو جس طرف دھکیلا گیا ہے۔ حتیٰ کہ کوئی دوسری قوت اس کی رفتار اور سمت کو نہ بدل دے اور اگر کوئی جسم چل رہا ہے تو وہ ہمیشہ اسی طرح چلتا رہے گا۔
2. دوسرا قانون یہ ہے کہ ایک خاص رفتار اور خاص سمت میں چلتے رہنے والی ہر شے اپنی رفتار اور سمت اس شے کی قوت کے تناسب کے حساب سے بدلے گی جس قوت نے اس کا رخ بدلا ہے۔
3. اور تیسرا اہم قانون یہ ہے کہ فطرت میں ہر عمل کا ایک ردِّعمل ہوتا ہے اور کسی شے کے عمل میں جس قدر قوت لگائی گئی ہے، اتنی ہی قوت اس کے ردِّعمل میں ظاہر ہوگی یعنی اگر آپ خلا میں ایک ساکن لوہے کے گولے کو کسی دوسرے گولے سے دھکا دیتے ہیں تو پہلا گولا جس تیزی اور قوت سے کسی سمت کو حرکت کرے گا تو ردِّعمل کی قوت دوسرے

گولے کو بھی اسی قوت سے مخالف سمت میں دھکیل دے گی۔

کشش ثقل کے بارے میں نیوٹن کا اصول یہ ہے کہ کائنات میں مادے کے ہر ذرے میں ایک قوت کشش ہوتی ہے جو دوسرے ذرے پر اثر ڈالتی ہے، چاہے وہ بہت چھوٹا سا ذرہ ہو یا بہت سارے ذرے مل کر ایک بڑا وجود بن گئے ہوں جیسے ہماری زمین سورج کے گرد ایک سال میں ایک چکر اس لیے پورا کرتی ہے کہ دونوں اجرام فلکی ایک دوسرے کی کشش ثقل (Gravity) میں بندھے رہتے ہیں یا جیسے ہمارا چاند ایک مہینے میں زمین کے گرد اپنا چکر پورا کر لیتا ہے کیونکہ زمین کی کشش چاند کو اپنی طرف کھینچتی رہتی ہے اور چاند زمین پر اپنی قوت کشش ڈالتا رہتا ہے اور چونکہ زمین کا حجم چاند سے چھ گنا زیادہ ہے اس لیے وہ چاند کو اپنے محور پر نہیں گھومنے دیتی۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے سامنے چاند کا ایک ہی حصہ رہتا ہے۔ دوسری طرف کا حصہ ہم نہیں دیکھ پاتے۔ بالکل اسی طرح سورج کا پہلا سیارہ عطارد (Mercury) سورج کی زبردست کشش سے اپنے محور پر نہیں گھوم پاتا۔ اس لیے اس کا ایک پہلو ہمیشہ سورج کی طرف رہتا ہے اور دوسرا اس کے مخالف سمت میں۔ یہی وجہ ہے کہ عطارد کا سورج کی طرف والا حصہ پگھلتے ہوئے لاوے کی طرح رہتا ہے اور جو حصہ سورج کے سامنے نہیں ہے اس کا درجۂ حرارت نقطۂ انجماد سے بھی کم رہتا ہے۔ گریوٹی یعنی قوت کشش کا یہ اصول یا قانون کائنات کے تمام اجرام فلکی پر اسی طرح عمل پیرا رہتا ہے۔

سائنس دانوں کا ماننا ہے کہ اس پوری کائنات میں فطرت کی چار قوتیں عمل پیرا ہیں جو اس طرح ہیں:

1. وہ کمزور قوت جس کے باعث ہر جوہر (ایٹم) کے الیکٹرون اپنے مرکز کے گرد باہمی کشش سے گھومتے رہتے ہیں۔
2. وہ قوت جو ایٹم کے مرکزے میں پروٹونز اور نیوٹرونز کو باندھے رکھتی ہے جب کہ نیوٹرونوں میں کسی بھی طرح کی مثبت یا منفی کشش نہیں ہوتی۔
3. پلازما: سائنس کی یہ دریافت بہت زیادہ پرانی نہیں۔ عام طور پر اس کو مادے کی چوتھی شکل تسلیم کیا جاتا ہے پہلے مادّے کی صرف تین اقسام تسلیم کی جاتی تھیں۔ 1. گیس 2. منجمد یعنی ٹھوس اور رقیق یا بہنے والی شکل۔ مادّے کی چوتھی شکل پلازما میں مادے کے (Positive) آیون (Ions) اور الیکٹرون تقریباً برابر برابر کی تعداد میں ہوتے ہیں اس لیے مقناطیسی طور پر نیوٹرل ہوتے ہیں اور زبردست طور پر Conductive ہوتے ہیں۔

مختصر طور پر یہ سمجھ لیجیے کہ مادے کی چوتھی شکل برقی مقناطیسی کیفیت ہوتی ہے اور فطرت کی تیسری زبردست قوت مانی جاتی ہے۔

4. چوتھی قوت اس مقناطیسی قوت کو کہا جاتا ہے جو مادے کے ایک ذرے سے لے کر بڑے سے بڑے اجرام فلکی میں ہوتی ہے۔ اردو میں ثقل زمین کو کہا جاتا ہے اسی لیے زمین کی مقناطیسی قوت کو کشش ثقل کہا جاتا ہے۔ اس مقناطیسی قوت کے دو قطب یا پول (Pole) ہیں یعنی قطب شمالی اور قطب جنوبی۔ مقناطیس اسی قوت کشش کے باعث ہمیشہ شمال اور جنوب کی طرف رہتا ہے۔

ان چاروں قوتوں میں سے پہلی تین قوتوں کے بارے میں سائنس داں اس نتیجے پر پہنچ چکے ہیں کہ یہ تینوں قوتیں ایک ہی قوت کے بین عمل یا حصے ہیں لیکن ابھی تک کشش ثقل ایک راز بنی ہوئی ہے۔ کچھ سائنس دانوں کو یقین ہے کہ یہ قوت کشش بھی انھی تین قوتوں کا ایک روپ یا حصہ ہے لیکن سائنس داں ابھی تک اس کا کوئی ثبوت تلاش نہیں کر سکے ہیں۔ زمین کی مقناطیسی قوت ہر چیز کو زمین سے باندھے رکھتی ہے۔ اسی کی زبردست قوت کے باعث ہماری زمین کے چاروں طرف فضا کا غلاف بنا ہوا ہے جو کائنات کی مہلک اور خطرناک قوتوں سے ہمیں محفوظ رکھتا ہے۔

زمین کی کشش کی یہ قوت کتنی زبردست ہے اس کے بارے میں صرف اتنا بتا دینا کافی ہے کہ اگر آپ قوت کشش سے آزاد ہو کر خلا میں جانا چاہتے ہیں تو آپ کو کم از کم سات میل فی سیکنڈ یا چوبیس ہزار میل فی منٹ کی رفتار سے زمین سے اوپر اٹھنا ہوگا تبھی آپ فضا پار کر کے خلا میں جا سکتے ہیں۔ اگر رفتار اس سے کم ہوئی تو قوت کشش آپ کو نیچے واپس کھینچ لے گی۔ خلا میں بھیجے جانے والے مصنوعی سیارے اسی رفتار سے بھیجے جاتے ہیں لیکن جب وہ خلا میں پہنچ جاتے ہیں تو پھر ان کو اس رفتار کی ضرورت نہیں رہتی۔

کشش ثقل کیا ہے، سائنس داں ابھی تک اس کی مفصل تعریف بیان کرنے سے قاصر ہیں۔ یہ بات تو یقینی ہے کہ یہ ایک طرح کی توانائی (Energy) ہے لیکن وہ کس طرح دوسرے اجرام فلکی پر اثر ڈالتی ہے یعنی یہ توانائی لہروں کی صورت میں کام کرتی ہے یا کسی اور طرح، اس بارے میں ابھی تک کوئی تصدیق شدہ نظریہ سامنے نہیں آیا ہے۔ آئن اسٹائن کے خیال کے مطابق کشش ثقل روشنی کی رفتار سے سفر کرتی ہے اور ایک معمولی سے ذرے سے لے کر بڑے سے بڑے اجرام فلکی میں ہوتی ہے۔ اگر ایک فٹ بال کی گیند کے برابر مادے کا حجم خلا میں ہے اور کروڑوں میل دور ایک سیارہ یا ستارہ موجود ہے تو دونوں کی قوت کشش ایک دوسرے کو اپنی طرف کھینچنے کی کوشش کرے گی لیکن چونکہ بڑے اجرام فلکی میں قوت کشش فٹ بال کے حجم

والے مادے سے لاکھوں گنا زیادہ ہوگی۔ اس لیے فٹ بال کی قوت بڑے جرم فلکی پر زیادہ اثر نہیں ڈال سکے گی لیکن اس کی قوت عمل پیرا ضرور رہے گی، بلکہ دونوں جسم ایک دوسرے کی قوت سے مرکز کشش بنالیں گے اور اپنا عمل جاری رکھیں گے۔ یہ دوسری بات ہے فٹ بال کی کمزور قوت کشش کے باعث یہ مرکز کشش بڑے جرم فلکی کے مرکز کشش کے قریب ہوگا۔ اس کی واضح مثال ہماری زمین اور چاند کی قوت کشش کا مرکزی نقطۂ کشش ہے۔ چاند کا حجم زمین کا چھٹا حصہ یا 1/6 ہے۔ وہ اپنے مدار پر گھومتے ہوئے سمندروں میں اپنی قوت کشش سے جوار بھاٹا لاتا رہتا ہے لیکن اگر یہ سوال کیا جائے کہ دونوں اجرام فلکی کا مرکز کشش دونوں کے درمیان کس جگہ سے یعنی دونوں اجرام کی کشش ثقل کس جگہ مل رہی ہیں تو آپ کو یہ جان کر شاید حیرت ہوگی کہ دونوں کا مرکز کشش زمین کے اندر ہی ہے۔ کیونکہ چاند کی قوت کشش زمین کی قوت سے صرف 1/6 ہے۔

سورج ان دونوں اجرام فلکی سے لاکھوں گنا بڑا ہے۔ اس کی قوت کشش بھی لاکھوں گنا زیادہ ہے۔ وہ بھی سمندر میں جوار بھاٹا لانے کا سبب بنتا رہتا ہے لیکن چونکہ وہ زمین سے اتنی زیادہ دور ہے کہ اس کی قوت کشش زمین تک آتے آتے چاند کی قوت کشش کے برابر رہ جاتی ہے۔

اہم بات یہ ہے کہ یہ قوت ایک ذرہ کی ہو یا کسی بڑے جرم فلکی کی، کبھی ختم نہیں ہوتی البتہ فاصلوں کے ساتھ کم ہوتی چلی جاتی ہے۔ کسی ایک ذرے کی کشش دور جاکر اس قدر کمزور ہو جاتی ہے کہ حساس آلے بھی شاید اس کو محسوس نہیں کر سکتے۔

اب یہاں سوال کیا جا سکتا ہے کہ کیا کشش ثقل کو ناپنے کا کوئی پیمانہ ہے؟

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ پیمانہ ہے لیکن وہ پیمانہ اس جسم کی مقدار کے مطابق ہوتا ہے جس سے وہ قوت کشش آرہی ہے۔

اس بات کو بہتر طور پر سمجھنے سے پہلے آپ کو دو لفظوں کے معنی سمجھنے ہوں گے۔ پہلا لفظ انگریزی کا اسپیڈ (Speed) ہے جس کو اردو میں ہم رفتار کہتے ہیں اور دوسرا لفظ انگریزی میں ایکسلریشن (Acceleration) ہے۔ سائنسی اصطلاح میں اردو میں اس کو تسریع یا اسراع کہا جاتا ہے۔ ان دونوں لفظوں میں فرق صرف اتنا ہے کہ "رفتار" کو ہم ایک قائم شے کہہ سکتے ہیں۔ مثلاً آپ اگر کسی کار میں اسی (80) میل فی گھنٹہ کی رفتار سے سفر کر رہے ہیں اور اسی رفتار پر تادیر قائم رہتے ہیں تو کار کی یہ تیزی رفتار کہی جائے گی لیکن اگر آپ کی کار ہر سیکنڈ رفتار بڑھاتی جا رہی ہے تو پھر یہ رفتار "اسراع" کہلائے گی۔

آپ نے یہ اکثر محسوس کیا ہوگا کہ اگر آپ کسی تیز رفتار گاڑی میں سفر کر رہے ہیں اور گاڑی اچانک رک جائے تو آپ کا جسم ایک جھٹکے سے آگے کی طرف جھک جائے گا یا گر پڑے گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب گاڑی چل رہی تھی تو اس کے ساتھ ہی آپ کا جسم بھی گاڑی کی رفتار سے ہی چل رہا تھا یعنی وہ "انرشیا" کے عالم میں تھا لیکن جب اچانک گاڑی رکی تو انرشیا کے قانون کے مطابق آپ کا جسم حرکت کرتے رہنے کی حالت میں رہنا چاہتا تھا اس لیے اچانک گاڑی رک جانے کی وجہ سے انرشیا کی قوت نے اس کو آگے دھکیل دیا۔

اس کا دوسرا تجربہ پہلے زمانے کی ٹرینوں میں سفر کرنے سے لگایا جا سکتا تھا جن کے انجن بھاپ سے چلتے تھے۔ بھاپ سے چلنے والے انجن پہلے بہت آہستہ حرکت میں آتے تھے، پھر دھیرے دھیرے رفتار پکڑنا شروع کرتے اور اسٹیشن کے سگنل سے نکلنے کے بعد وہ پوری رفتار پکڑ لیتے تھے۔ اس دوران مسافر ڈبوں میں اپنے جسموں پر ایک طرح کا دباؤ محسوس کرتے رہتے تھے جیسے کوئی قوت ان کو ڈبے کے تختہ سے دبا رہی ہو— یہ بھی انرشیا کا ہی نتیجہ تھا کیونکہ گاڑی چلنے سے پہلے آپ کا جسم ساکت تھا، پھر گاڑی چلی تو انرشیا نے آپ کے ساکت جسم کو پیچھے دھکیلا اور جوں جوں رفتار بڑھتی چلی گئی یہ دباؤ بڑھتا گیا۔ پھر جب گاڑی نے اپنی مقررہ رفتار حاصل کر لی تو آپ کے جسم پر سے انرشیا کا اثر ختم ہو گیا یا یہ کہیے کہ انرشیا گاڑی کی رفتار کے مطابق ہو گیا۔

آج کل خلا میں جو خلا باز بھیجے جاتے ہیں ان کو یہ دباؤ سہنے کی مشق کرائی جاتی ہے۔ ان خلا بازوں کو لے جانے والے راکٹوں کی رفتار بڑھتے بڑھتے ایک سیکنڈ میں سات میل تک ہو جاتی ہے۔ اس لیے زمین کی کشش کا دباؤ اس قدر بڑھ جاتا ہے کہ عام انسان اس کو برداشت نہیں کر سکتا۔ خلائی سفر کے اس دباؤ کو "گریوٹی" کے پیمانے سے ناپا جاتا ہے یعنی ایک گریوٹی، دو گریوٹی یا تین گریوٹی۔ اس کا مطلب ہے کہ تین زمینوں کی کشش ثقل کا اثر! ایک عام آدمی تین یا چار گریوٹی کا دباؤ برداشت کر سکتا ہے اور ایک تربیت یافتہ خلا باز سات آٹھ گریوٹی تک کا دباؤ برداشت کر لیتا ہے اور یہ دباؤ خلا باز پر اس وقت تک پڑتا اور بڑھتا رہتا ہے جب تک راکٹ خلا میں نہیں پہنچ جاتا اور خلائی جہاز ایک رفتار پر قائم نہیں ہو جاتا۔ اس کے بعد کوئی دباؤ ہی نہیں رہتا، ہر چیز بے وزن ہو جاتی ہے کیونکہ خلا میں اتنی دوری پر زمین کی کشش بہت کم ہو جاتی ہے۔

اب آخری سوال اس سلسلے میں یہ رہ جاتا ہے کہ زمین کی کشش ثقل کسی شے کو کتنی قوت سے اپنی طرف کھینچتی ہے۔ یہاں ایک بات سمجھنی بہت ضروری ہے اور وہ یہ کہ قوت کشش ہر شئے پر ایک جیسا ہی اثر ڈالتی ہے یعنی اگر کسی پرندے کا پر یا روئی کا ہلکا گولا اور لوہے کا ایک بہت وزنی گولا ایک ساتھ نیچے پھینکے جائیں تو وہ تینوں چیزیں ایک ہی رفتار سے ایک ہی وقت میں نیچے آکر گریں گے لیکن شرط یہ ہے کہ اس کشش اور گرنے والی شئے کے درمیان کوئی

اور قوت نہ آئے۔ مثلاً اگر فضا میں ہوا ہے تو روئی کے ٹکڑے یا پرندے کے پر کے درمیان ہوا آ جائے اور ان کی رفتار کو کم کر دے گی۔

ایک کہانی مشہور ہے کہ مشہور سائنس داں گلیلیو گلیلی نے جب یہ نظریہ پیش کیا کہ زمین کی قوت کشش ہر شے پر ایک جیسا اثر ڈالتی ہے خواہ وہ کتنی ہی ہلکی یا بھاری ہو تو لوگوں نے اس کی بات پر یقین نہیں کیا۔ چنانچہ اس نے عالمی شہرت یافتہ پیسا (Pisa) کے مینار پر ایک تجربہ کر کے دکھایا اور اپنی بات سچ ثابت کر دی۔ پیسا کا مینار اس لیے مشہور ہے کہ وہ قوت کشش کے مرکز کے اصول کے مطابق بالکل سیدھا نہیں ہے بلکہ ایک طرف جھکا ہوا ہے حالانکہ سچائی یہ ہے کہ وہ ٹیڑھے پن کے باوجود مرکز کشش پر ہی ٹھہرا ہوا ہے۔ سائنس کے طالب علم خود بھی اس کا تجربہ اس طرح کر سکتے ہیں کہ وہ شیشے کی ایک لمبی نلی لے کر اس میں سے ہوا نکال دیں پھر اس میں ایک پر اور کوئی وزنی سکہ ایک ساتھ ڈالیں۔ اس طرح وہ دیکھیں گے کہ پر اور سکہ دونوں ایک ساتھ سطح زمین پر گریں گے۔

اب صرف یہ بات باقی رہ جاتی ہے کہ کشش ثقل کتنی قوت سے اشیا یا اجسام کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔ تو اس کا جواب ہے کہ قوت کشش 32 فٹ فی سیکنڈ اور فی سیکنڈ کی رفتار سے چیزوں کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔

اس جملہ میں فی سیکنڈ اور فی سیکنڈ کا مطلب یہ ہے کہ اگر کسی اونچی عمارت سے ایک گیند نیچے ڈالیں تو وہ ایک سیکنڈ میں بتیس فٹ نیچے گرے گی لیکن اس کے ساتھ ہی اس کے گرنے کی رفتار میں بتیس فٹ فی سیکنڈ اضافہ ہوتا چلا جائے گا۔ اس کا مطلب ہے کہ کوئی چیز اوپر سے اگر بتیس فٹ فی سیکنڈ کے حساب سے نیچے گر رہی ہے تو دوسرے سیکنڈ کے آخر میں اس کی رفتار چونسٹھ فٹ فی سیکنڈ ہو جائے گی اور تیسرے سیکنڈ میں یہ رفتار چھیانوے فٹ فی سیکنڈ ہو جائے گی اسی طرح اسی تناسب سے یہ رفتار بڑھتی چلی جائے گی حتیٰ کہ وہ چیز زمین پر آ گرے گی۔ لیکن سائنسی زبان میں کسی چیز کے گرنے کی رفتار کو ہم صرف رفتار یا اسپیڈ (Speed) نہیں کہہ سکتے بلکہ اس کے لیے سائنسی اصطلاح ویلوسٹی (Velucity) ہے یعنی وہ رفتار جو مسلسل گھٹتی یا بڑھتی رہتی ہو۔ لیکن ہم پہلے تحریر کر چکے ہیں کہ قوت کشش کسی جرم فلکی کے حجم پر منحصر ہوتی ہے۔ حجم کم ہوگا تو کشش کی قوت بھی کم ہوگی۔ حجم زیادہ ہوگا تو قوت بھی زیادہ ہوگی مثلاً یہی تجربہ اگر ہم چاند کی سطح پر کریں تو نتیجہ بالکل الگ ہوگا۔ دسویں منزل کی عمارت سے پھینکی گئی کوئی چیز زمین پر اگر بتیس فٹ فی سیکنڈ فی سیکنڈ ہوگی تو چاند پر اس کے نیچے کی رفتار 6.7 فٹ فی سیکنڈ فی سیکنڈ ہوگی کیونکہ چاند کا حجم زمین کے مقابلہ 1/6 ہے۔ یہاں زمین پر کسی چیز کا وزن اگر چھ کلوگرام ہے تو چاند کی سطح پر اس کا وزن صرف ایک کلوگرام رہ جائے گا یعنی زمین پر پھینکی گئی جس شے کی رفتار تین سیکنڈ میں 96 فٹ ہوگئی تھی، چاند کی سطح پر تین سیکنڈ میں اسی چیز کی ''ویلوسٹی'' 144 فٹ ہو جائے گی۔

ان دو مثالوں کے بعد اگر سورج کی قوت کشش کا حساب لگانا چاہیں تو ریاضی کے ذریعے حساب لگاتے رہیے۔ اس قوت کو کوئی نمبر دینا تقریباً ناممکن ہوگا۔ مشتری (Jupiter) ہمارے نظام شمسی کا سب سے بڑا سیارہ ہے، اگر انسان کو اس سیارے پر اتار دیا جائے تو یقین ہے کہ مشتری کی کشش ثقل سے اس کا وزن اتنا بڑھ جائے گا کہ اپنے ہی وزن سے اس کی ہڈیاں ٹوٹ کر چور چور ہو جائیں گی۔

□□□

رابطہ:
Y-5, New Ranjit Nagar
New Delhi-110 008

حیات جاوید

مصنف: الطاف حسین حالی

مولانا الطاف حسین حالی نہ صرف ایک رجحان ساز شاعر اور نقاد تھے بلکہ انھوں نے سوانح نگاری میں بھی اپنا لوہا منوایا اور ''حیات سعدی''، ''یادگار غالب'' اور ''حیات جاوید'' جیسی کتابیں یادگار چھوڑیں۔ ''حیات جاوید'' میں حالی نے سرسید کی زندگی کے حالات، افکار اور خیالات پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ اس کتاب کی اہمیت یوں بھی ہے کہ حالی سرسید سے بے حد قریب تھے اور سرسید نے ملک و قوم کی جو خدمت کی اس کے عینی شاہد۔

پانچواں ایڈیشن، صفحات: 907، قیمت: -/181 روپے

کلیات چودھری محمد علی ردولوی (تین جلدوں میں)

ترتیب و تدوین: مسعود الحق

چودھری محمد علی ردولوی اپنے زمانے کے ایک روشن خیال اور شگفتہ نگار ادیب تھے۔ ان کا تعلق انیسویں صدی کے ادیبوں کی اس نسل سے تھا جس میں ولایت علی بمبوق، سجاد حیدر یلدرم، پریم چند، مولانا ابوالکلام آزاد اور نیاز فتح پوری وغیرہ شامل تھے۔ اس کلیات میں ان کی تمام تحریریں جمع کر دی گئی ہیں۔

جلد اوّل، صفحات: 344، قیمت: -/172 روپے
جلد دوم، صفحات: 455، قیمت: -/172 روپے
جلد اوّل، صفحات: 450، قیمت: -/172 روپے

نوٹ: طلبہ کے لیے 45% اور اساتذہ کے لیے 40% کی خصوصی رعایت۔ تاجرانِ کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک -8، ونگ -7، آر. کے. پورم، نئی دہلی -110 066

بھرت جھن جھن والا

قابل تجدید کاری توانائی کے وسائل

اگست 2005 میں توانائی کو آرڈینیشن کمیٹی سے خطاب کرتے ہوئے ڈاکٹر منموہن سنگھ نے ملک کے توانائی کے وسائل میں اضافہ پر زور دیا تھا۔ انھوں نے کہا تھا 'جوہری توانائی کا رول بڑھانا ہوگا، ہمیں قابل تجدید کاری توانائی کے وسائل کے فروغ اور ماہر تکنیکوں کے استعمال پر گہرائی سے غور کرنا ہوگا۔'' وزیر اعظم واضح طور پر کہتے ہیں کہ اس کا رول زیادہ ہوگا۔ امریکہ کے ساتھ جوہری معاہدے کے ضمن میں بھی وہ جوہری توانائی کی اہمیت کو بار بار دہراتے ہیں۔ لیکن دیگر وسائل پر وہ صرف گہرائی سے سوچنے کی بات کرتے ہیں۔ وزیر اعظم کا جھکاؤ جوہری توانائی کی سمت ہے۔

وزیر اعظم کو اس پالیسی پر دوبارہ غور کرنا چاہیے۔ سبب یہ ہے کہ جو مسائل تیل اور کوئلے میں ہیں وہ جوہری توانائی میں بھی موجود ہیں۔ ہمارے تیل اور کوئلے کے ذخائر محدود ہیں لہٰذا ہمیں ان ایندھنوں کو بڑی مقدار میں درآمد کرنا پڑ رہا ہے۔ ان درآمدات کے لیے ہی ہمیں امریکہ سے سر جھکا کر معاہدہ کرنا پڑا ہے۔ دونوں طرح سے ہم دیگر ممالک پر انحصار کرتے ہیں۔ دوسرا مسئلہ آلودگی کا ہے۔ جوہری توانائی پیدا کرنے میں ریڈیو ایکٹو فضلہ نکلتا ہے جو انسانی صحت کے لیے انتہائی ضرر رساں ہے۔ اس فضلے کو ٹھکانے لگانے کے لیے ابھی تک کوئی طریقہ تلاش نہیں کیا گیا ہے۔ اسے کنٹینرزوں میں بھر کر رکھنا پڑتا ہے۔ کئی ممالک ان کنٹینرزوں کو زمین کے اندر گہرے گڑھے کھود کر اس میں ڈال رہے ہیں۔ جس طرح تیل کے استعمال سے کاربن ڈائی آکسائڈ گیس نکل کر فضا کو آلودہ کرتی ہے اسی طرح جوہری توانائی سے فضلہ نکل کر زمین کو آلودہ کرتا ہے۔ تیسرا مسئلہ تحفظ کا ہے۔ چند سال قبل روس کے چرنوبل ایٹمی پروجیکٹ میں حادثہ ہونے سے سیکڑوں لوگوں کی موت ہوگئی تھی اور بہت بڑے علاقے میں ریڈیو ایکٹو آلودگی پھیل گئی تھی یعنی جوہری توانائی میں تحفظ کا فقدان ہے۔

فروری 2006 میں نیویلی لگنائٹ کارپوریشن کی گولڈن جوبلی کے موقع پر وزیر اعظم نے کہا تھا کہ انسانی معاشرہ قدرت سے جتنا لیتا ہے، اتنا واپس دینا چاہیے۔ جوہری توانائی اس کسوٹی پر کھری نہیں اترتی ہے۔ ان مسائل کو دیکھتے ہوئے وزیر اعظم کو دیگر وسائل پر توجہ دینی چاہیے۔ پہلا متبادل بایوڈیزل کا ہے۔ اس وقت بایوڈیزل بیج سے بنایا جاتا ہے۔ اس کام کے لیے ہندوستان میں جٹروپا یا رتن جودھ کے بیج کا استعمال کیا جا رہا ہے جب کہ امریکہ میں مکئی کے دانے کا۔ دانے میں اسٹارچ اور کاربوہائیڈریٹ ہوتے ہیں جن سے بایوڈیزل بنایا جاتا ہے لیکن جٹروپا اور مکئی کے تنے اور پتی میں بھی توانائی ہوتی ہے جو کہ سیلولوز کی شکل میں ہوتی ہے۔ اس توانائی کو ڈیزل یا دیگر فائدے مند شکل میں بدلنا ابھی تک ممکن نہیں ہوسکا ہے۔ اگر سیلولوز میں موجود توانائی کو قابل استعمال بنایا جاسکے تو توانائی کا ایک بڑا ذریعہ ہمیں مل جائے گا۔ ایک خبر کے مطابق تیل کمپنی شیوران سالانہ 1500 کروڑ روپئے بایوڈیزل پر تحقیق میں لگا رہی ہے۔ کمپنی کے وائس چیئرمین نے کہا ہے کہ تیل کا مستقبل مشکوک ہے اس لیے یہ فیصلہ کیا گیا ہے۔ انھیں اعتماد ہے کہ آئندہ تیس برسوں تک کمپنی تیل کے کاروبار سے منافع کما سکے گی۔ لیکن آئندہ پچاس برسوں تک بھی ایسا ہو سکے گا، اس میں شک ہے۔ اپنے طویل مدتی مفادات کے لیے کمپنی اس سمت میں سرمایہ کاری کر رہی ہے۔ امریکی سنٹرل بینک کے ریٹائرڈ چیئرمین ایلن گرین اسپین نے جون 2006 میں امریکی پارلیمنٹ میں دیے بیان میں کہا کہ حالانکہ بایوڈیزل کا متبادل موجود ہے لیکن طویل مدت میں سیلولوز سے ڈیزل بنانے سے ہی کام چلے گا۔ وزیر اعظم کو چاہیے کہ اس سمت میں سرمایہ کاری کریں اور مستقبل کی کمان اپنے ہاتھ میں لیں۔

دوسرا متبادل شمسی توانائی کا ہے اس وقت فوٹو ولٹیک سیل مہنگی ہے۔ اس تکنیک میں اصلاح ہونے سے ہمیں توانائی کا بڑا وسیلہ میسر ہو جائے گا۔ انگلینڈ میں واقع کاربن فری تنظیم کا اندازہ ہے کہ پتلے سلی کان ویفر تکنیک کے فروغ سے شمسی توانائی کی لاگت کم ہو جائے گی۔ اس وقت شمسی توانائی کا استعمال بنیادی طور پر سرکاری سبسڈی کی بنیاد پر ہو رہا ہے۔ چونکہ یہ سیل مہنگی ہے۔ توانائی کے اس وسیلے کا ماحولیات پر کم سے کم منفی اثر پڑتا ہے۔ سورج سے آنے والی جو توانائی ریگستان کو گرم کرنے میں لگ رہی ہے اسی سے ایئر کنڈیشنر چلائے جاسکتے ہیں۔ اس توانائی میں گلوبل وارمنگ کا مسئلہ پیدا نہیں ہوتا ہے۔ وزیر اعظم کو چاہیے کہ نئی نسل کے فوٹو ویلٹیک سیل پر تحقیق کے لیے خطیر رقم مہیا کرائیں۔

تیسرا متبادل ہوا سے پیدا ہونے والی توانائی کا ہے۔ اس وقت ہوا سے توانائی کی پیداوار بڑے 'ونڈ فارموں' پر ہی سودمند ہے۔ ایک امکان یہ ہے کہ

ہر گھر کی چھت پر ہوا سے چلنے والا جنریٹر لگا دیا جائے۔ اس تکنیک کی فروخت کے لیے کوشش کی جا سکتی ہے۔

چوتھا متبادل توانائی کی کھپت کم کرنے کا ہے۔ جس طرح زیادہ کھانا کھا کر اسے ہاضم چیزوں سے ہضم کرنے کی حد ہے اسی طرح زیادہ توانائی کی کھپت کر کے اس کے منفی نقصانات سے بچنے کی بھی حد ہے۔ ہمیں چاہیے کہ زیادہ توانائی کے استعمال پر روک لگائیں۔ سنٹر فار امریکن پروگریس کی شائع کردہ کتاب ''توانائی کے مستقبل'' میں تجویز پیش کی گئی ہے کہ توانائی۔ غیر ماہر کار پر ٹیکس لگا کر توانائی۔ ماہر کار کو سبسڈی دینی چاہیے۔ ایسا کرنے سے توانائی غیر ماہر کاریں مہنگی ہو جائیں گی اور توانائی ماہر کاریں سستی۔ توانائی ماہر کاروں کا استعمال بڑھے گا۔ اسی طرح گاڑی کے ٹائر کے معیار پر بھی سرکاری کنٹرول ہونا چاہیے۔ اس وقت امریکہ میں نئی کاروں کے لیے ضروری ہے کہ کم آواز پیدا کرنے والے ٹائر لگائیں لیکن بازار میں بکنے والے ٹائروں پر ایسی پابندی نہیں ہے۔ تجویز ہے کہ بازار میں بکنے والے تمام ٹائروں پر کم شور پیدا کرنے کے معیار کو ضروری بنا دینا چاہیے۔

توانائی کی کھپت کم کرنے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ نجی کار کی جگہ عوامی بسوں کو فروغ دیا جائے۔ کئی مغربی ممالک میں نظم ہے کہ کار میں کم از کم دو لوگوں کو سفر کرنا ہوگا۔ اکیلے چلنے والے کا چالان کر دیا جاتا ہے۔ اس سے لوگوں کا مزاج بنتا ہے کہ کار پول بنا کر سفر کریں۔ غیر ممالک میں کار پول چلانے والی کمپنیاں ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے والے لوگوں میں رابطہ کراتی ہیں، جس طرح شادی بیورو شادی کے لیے رابطہ کراتے ہیں۔ تیل کی اونچی قیمتوں کا فائدہ یہ ہوگا کہ لوگ پبلک ٹرانسپورٹ کا زیادہ استعمال کریں گے جس سے تیل کی کھپت کم ہوگی۔ بنیادی طور پر ہمیں کار کے کلچر کو ترک کر دینا چاہیے۔ اس وقت ترقی کا ایک رائج معیار کار ہے۔ امیری کی علامت مرسڈیز کار ہے۔ سرکار کو چاہیے کہ اشتہارات کے ذریعہ اس طرح کے رجحان کی حوصلہ شکنی کرے۔

وزیر اعظم نے کہا ہے کہ ہم جتنا قدرت سے لیتے ہیں، اتنا واپس کر دینا چاہیے۔ تیل اور جوہری توانائی کا استعمال بڑھانے سے ان کا یہ ارادہ پورا نہیں ہوگا۔ اس لیے ملک کو قدرت سے کم توانائی لینے کی پالیسی پر عمل کرنا چاہیے۔ ساتھ ہی ساتھ توانائی کے قابل تجدید کاری وسائل جیسے سیلولوز سے بنے بایو ڈیزل، شمسی توانائی اور ہوا سے پیدا ہونے والی توانائی پر زیادہ توجہ دینی چاہیے۔

□□□

رابطہ:
Lakshmoli, PO Maletha
Via Kirti Nagar, Dist. Tehri Garhwal
Uttaranchal-249161

احمقوں کی جنت

مصنف: شنکر/ مترجم: ڈاکٹر شریف احمد

''احمقوں کی جنت'' میں بچوں کے لیے 12 چھوٹی چھوٹی مزیدار اور سبق آموز کہانیاں ہیں جنہیں پڑھتے ہوئے بچے اپنی ہنسی روک نہیں سکتے۔

ہر کہانی کے ساتھ کارٹونی تصویر بھی دی گئی ہے۔

صفحات: 24، قیمت:-/12 روپے

ربن

مصنف: سوکمار شنکر/ مترجم: کے. پی. رائے زادہ

بچوں کو اپنے کھلونے، میک اَپ اور کھیل کود سے بڑی دلچسپی ہوتی ہے اور وہ ان موضوعات پر خوب مزے لے لے کر باتیں کرتے ہیں۔ انہی سامان تفریح میں ایک ''ربن'' ہے جو مالا کی سالگرہ پر اس کی ماں دیتی ہے۔ یہ ''ربن'' کس کس طریقے سے اس تک پہنچتی ہے کہانی میں اس کا پرتجسس بیان بچوں کو حیرت میں ڈال دیتا ہے۔

صفحات: 16، قیمت-/15 روپے

نوٹ: طلبہ کے لیے 45%اور اساتذہ کے لیے 40% کی خصوصی رعایت۔ تاجرانِ کتب کو حسبِ ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر. کے. پورم، نئی دہلی-110 066

وہاب قیصر

مولانا آزاد، لسان الصدق اور فروغ اردو

مولانا ابوالکلام آزاد نے پندرہ سال کی عمر میں نومبر 1903 میں کلکتہ سے ماہنامہ ''لسان الصدق'' جاری کیا۔ اس کے پہلے شمارے کے سرورق پر یہ درج تھا :

''لسان الصدق ماہوار رسالہ ایڈیٹر۔ ابوالکلام آزاد دہلوی

الصدق منجی والکذب یھلک، لسان الصدق کا دستور عمل ہے۔ اس کا فرض ہے کہ یہ قوم کو کذب سے بچائے اور راستی پر لائے، جب اس کا فرض منصبی صرف حق گوئی قرار دیا گیا، تو اس کی امید قوم کو اس سے نہیں رکھنی چاہیے کہ یہ انھیں ایسے ترانے سنائے گا۔ جو نہایت شیریں معلوم ہوں گے۔ سچی بات ہمیشہ کڑوی معلوم ہوتی ہے پھر'' سچائی کی زبان'' کیوں کر شیریں معلوم ہوگی؟ یہ ہمیشہ تم کو کڑوی کسیلی باتیں سنائے گا، جو اگرچہ تمھیں ناگوار معلوم ہوں گی لیکن اس زمانے کو دور نہ سمجھو، جب کہ صدق کا منجی ہونا اور کذب کا مہلک ہونا تم پر ظاہر ہوجائے گا۔

اس رسالے کے خاص مقاصد حسب ذیل ہیں :

1. سوشل ریفارم۔ یعنی مسلمانوں کی معاشرت اور رسومات کی اصلاح کرنا۔
2. ترقی۔ اردو یعنی اردو زبان کے علمی لٹریچر کے دائرہ کو وسیع کرنا۔
3. علمی مذاق کی اشاعت بالخصوص بنگالہ میں۔
4. تنقید۔ یعنی اردو تصانیف پر منصفانہ ریویو کرنا۔''

اس شمارے میں ان تمام مقاصد کی تشریح بھی تفصیل کے ساتھ شائع کی گئی تھی۔ پہلے ہی شمارے میں رسالے کے اغراض و مقاصد کو تفصیل کے ساتھ واضح کردینا جواں سال مدیر کے بلند عزائم، مستقل مزاجی اور بصیرت کو ظاہر کرتا ہے۔ ''لسان الصدق'' جب نکلا تو بقول مالک رام ''دھوم مچ گئی'' تھی۔ اس کے دھوم مچانے کے سلسلے میں ابوسلمان شاہجہاں پوری لکھتے ہیں :

'' ملک کے مشہور جرائد و اخبارات مثلاً وکیل۔ امرتسر، پیسہ اخبار۔ لاہور، مخزن۔ لاہور، افسانہ۔ حیدرآباد دکن، مشیر الاخبار۔ مراد آباد، ریاض الاخبار۔ گورکھپور، دلچسپ۔ امرتسر، ایڈورڈ گزٹ۔ شاہجہاں پور، نظام الملک۔ مراد آباد نے اس کے معیار علم و صحافت، مضامین کے تنوع فکر کی نکتہ آفرینی۔ مباحث کی جدت طرازی، ترتیب و تہذیب کے حسن، اسلوب کی شگفتگی، انشا کی دلربائی، طرز ادا کی ندرت، قلم کی پختگی اور مقاصد کی اہمیت پر داد و تحسین کے پھول برسائے۔''

(ارمغان آزاد۔ ص106)

مولانا آزاد نے ''لسان الصدق'' کے شماروں میں اصلاح معاشرہ کے موضوع پر جہاں کھل کر لکھا ہے اور بے جا رسومات اور توہمات سے مسلمانوں کو نجات دلانے کی کوشش کی ہے وہیں پر انھوں نے اردو کی ترقی کو ایک تحریک کے طور پر عمل میں لانے کا بیڑا اٹھایا تھا۔ اس موضوع پر نہ صرف انھوں نے متعدد شماروں میں لکھا بلکہ دوسرے نثر نگاروں کے مضامین کو بھی اس میں شائع کیا۔ ''لسان الصدق'' کے اغراض و مقاصد میں دوسرا مقصد اردو کی ترقی کا رہا ہے۔ پہلے شمارے میں اس مقصد کی تفصیلات پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں کہ'' کوئی زبان اس وقت تک ترقی نہیں کرسکتی جب تک اس میں جدید اور تکنیکی علوم پر لکھی گئی کتابیں شائع نہ کروائی جائیں۔'' اس سے صاف ظاہر ہے کہ سائنس کا احاطہ کیے بغیر جدید اور تکنیکی علوم کی تکمیل نہیں ہوسکتی۔ اس معاملے میں وہ اردو زبان اور اس کی کتابوں کا دوسری مشرقی زبانوں عربی، فارسی اور ترکی سے تقابل کرتے ہیں۔ ان کا یہ ماننا ہے کہ عربی اور ترکی زبانیں جدید علوم کو یورپی زبانوں سے جس تیزی سے اپنے میں سمو رہی تھیں اور مالا مال ہو رہی تھیں وہیں اردو زبان مخرب اخلاق ناولوں کی اشاعت کے انبار لگا رہی تھی۔ اسی مناسبت سے اس زبان کے پڑھنے والوں کا ذوق بھی نچلے درجے کا ہوکر رہ گیا تھا۔ کتابوں کی اشاعت کے معاملے میں مولانا آزاد کا یہ خیال تھا کہ اردو زبان میں کسی خاص مقصد اور منصوبے کے تحت کتابیں لکھی نہیں جارہی تھیں۔ اہل قلم وہی تحریر کر رہے تھے جس کی اردو والوں میں مانگ تھی۔ رسالوں کے مدیران اور ناشرین انھی مضامین اور کتابوں کی اشاعت عمل میں لا رہے تھے جن کی پذیرائی ہوتی۔ مولانا کا یہ ماننا تھا کہ دوسری زبانوں کے جدید علوم کو ان زبانوں سے جن میں وہ دستیاب ہیں اپنی زبان میں ترجمہ کے ذریعہ منتقل کررہے ہیں۔ مولانا نے اس بات کی صلاح دی کہ یہی کام اردو کے نثر نگار، ادارے اور ناشرین ایک پروگرام کے تحت روبہ عمل

لائیں تاکہ اردو کی ترقی ہو سکے۔

مولانا آزاد، انجمن ترقی اردو کے قیام عمل میں لانے کو فال نیک قرار دیتے ہیں جس کو محمڈن ایجوکیشن کانفرنس کے لٹریری سیکشن نے عملی جامہ پہنایا تھا۔ وہ اس بات کی امید کا اظہار بھی کرتے ہیں کہ انجمن بہت جلد اردو میں جدید علوم کو منتقل کرتے ہوئے اس قومی زبان کو علمی زبانوں کے زمرے میں لاکھڑا کرے گی۔ انھوں نے یہ تسلیم کیا کہ ''لسان الصدق'' کا جو دوسرا مقصد ہے وہ دراصل انجمن ترقی اردو کی ترقی ہی سے متعلق ہے۔ اس طرح مولانا نہ صرف انجمن ترقی اردو کے امور کو فروغ دینے کے لیے اپنے رسالے میں لکھتے رہے بلکہ انجمن کی رہنمائی بھی کرتے رہے کہ وہ اردو کے فروغ کے لیے زیادہ سے زیادہ سائنسی کتابوں کی اشاعت پر توجہ دے۔ انجمن ترقی اردو کے کاموں میں مولانا کی اس درجہ دلچسپی کی وجہ سے نہ صرف انھیں مجلس عام میں شامل کیا گیا بلکہ ایک مخصوص عرصہ کے لیے اسسٹنٹ سکریٹری بھی بنایا گیا جب کہ مولانا شبلی نعمانی اس کے سکریٹری تھے۔ مولانا آزاد نومبر 1903 کے ''لسان الصدق'' میں انجمن ترقی اردو کے حوالے سے تحریر کرتے ہیں:

''انجمن ترقی اردو نے اردو زبان کے علمی دائرے کو وسیع کرنے کی یہ صورت تجویز کی ہے کہ انگریزی، عربی، فارسی کی علمی اور فنی کتابیں شگفتہ اردو میں ترجمہ کرکے شائع کی جائیں، جن کی اشاعت سے قوم میں لغو اور بے نتیجہ ناولوں کے بجائے علمی کتابوں کے مطالعہ کا شوق پیدا ہو، چنانچہ انگریزی، عربی، فارسی کی جو کتابیں انجمن نے انتخاب کی تھیں ان کے ترجمہ اور طبع کا انتظام نہایت معقول طریقے سے ہو رہا ہے اور امید ہے کہ بہت جلد کتابیں طبع ہو کر ملک میں روشنی پھیلائیں گی......''

اگست اور ستمبر 1904 کے ''لسان الصدق'' میں ایڈیٹر کے حوالے سے مولانا آزاد کا ایک مضمون بعنوان'' ترقی اردو اور تراجم علوم وفنون کا سلسلہ نمبر (1) '' شائع ہوا تھا۔ جس میں اردو زبان ایک علمی زبان کا درجہ کیوں کر حاصل کرسکتی ہے؟ جیسے سوال کا جواب تفصیل سے دیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں عربی اور دیگر زبانوں کے حوالے سے یہ واضح کیا گیا کہ علمی زبان بننے کے لیے دو حالتیں ضروری ہوتی ہیں۔ ایک وہ زبانیں جو ذاتی سرمایہ رکھتی ہیں اور دوسری وہ زبانیں جو دوسری علمی زبانوں سے علوم بذریعہ تراجم حاصل کرتی ہیں۔

اگر اردو زبان کا تاریخی پس منظر میں جائزہ لیا جائے تو پتہ چلے گا کہ اس کو ابتدا سے ایسا ماحول نہیں ملا کہ وہ سائنسی اور تکنیکی مواد کو اپنے میں سمو سکے اور علمی زبان کے زمرے میں شامل ہو سکے۔ چنانچہ اس کے علمی زبان نہ بننے کی وجہ کیا ہے؟ اور وہ کیوں کر علمی زبان میں شامل ہو سکتی ہے۔ اس کے بارے میں مولانا آزاد لکھتے ہیں:

''اردو زبان ایک ایسے زمانے میں پیدا ہوئی جب کہ اسلامی علوم وفنون کی ترقی کا دور ختم ہو چکا تھا اور تنزل کی بنیادیں مضبوط ہو گئیں تھیں۔ اس نے ایک ایسی سوسائٹی میں پرورش پائی جو علوم وفنون سے بالکل بے خبر تھی اور اپنی بے بہا زندگی بے فکری اور لاابالی کی نذر کر چکی تھی، آنکھ کھول کر اس نے جس کو دیکھا اسی حالت میں مست دیکھا۔ سوسائٹی ہی کا یہ اثر تھا کہ اسے بچپن ہی سے عشق ومحبت کی چاشنی پسند آگئی اور اپنے شباب کا زمانہ اسی عشق ومحبت کے جذبات میں صرف کر دیا۔ ہندوستان کی سلطنت میں جب انقلاب ہوا اور ایک متمدن قوم نے سلطنت کی باگ اپنے ہاتھ میں لی تو اس کی علمی زبان کا اردو پر بھی اثر پڑنے لگا۔ یہ پہلا موقعہ تھا کہ اردو علمی صورت سے روشناس ہوئی، اسی تمدنی اثر سے اخبارات جاری ہوئے، کتابیں لکھی گئیں۔ لوگوں کو جدید علوم کا شوق ہوا، انگریزی سے کتابیں اردو میں ترجمہ کی گئیں اور بعض مضامین پر بھی علمی طریقہ سے کتابیں تصنیف کی گئیں، غرض یہ کہ اردو جس گہری نیند میں سو رہی تھی، اس سے ایک کروٹ لی، زمانہ کی ضرورتوں سے واقف ہوئی اور آج تک کچھ نہ کچھ ترقی کرتی رہی۔

لیکن درحقیقت نہ تو ان چند اخبارات سے یہ علمی زبان بن سکتی ہے اور نہ ان ترجموں سے جو متفرق طور پر شائع ہو رہے ہیں، اردو زبان جب ہی ترقی کر سکتی ہے اور علمی زبان بن سکتی ہے جب کہ اس میں باضابطہ تراجم علوم وفنون کا سلسلہ قائم کیا جائے، جدید علوم کے ہر صیغہ میں مبسوط اور جامع کتابیں ترجمہ کی جائیں۔ علوم وفنون کا کوئی پہلو یورپ کی زبانوں میں ایسا نہ ہو جس کا اردو میں ترجمہ موجود نہ ہو، جب تک اردو میں ایسا منظم سلسلہ قائم نہ ہوگا اس کی علمی ترقی محال ہے۔''

اپریل اور مئی 1905 کی اشاعت میں اس بات کا اظہار کیا گیا کہ ''لسان الصدق'' اب اپنی اصلی صورت اختیار کر چکا ہے اور اس کی اصلی زندگی ابھی سے شروع ہوتی ہے۔ لیکن یہ رسالہ وہ ''لسان الصدق'' نہیں رہا ہے جس کو قارئین سال بھر تک معمولی نگاہ سے دیکھتے رہے ہیں۔ ان کا کہنا تھا کہ ''لسان الصدق'' اس وقت ایک ایسے رسالے سے عبارت ہے جو کارآمد، ملک کے لیے مفید اور سائنٹفک مضامین کا ایک عمدہ مخزن ہے جس کے کارآمد اور مفید بنانے میں تمام ممکن ذرائع سے کام لیا گیا ہے۔ اس شمارے میں مولانا ایک مقام پر اس ارادے کا اعادہ کرتے ہیں کہ ''لسان الصدق'' کے آئندہ مضامین کے لیے تین علوم کا انتخاب کر لیا گیا ہے جن کی اشاعت کا مقصد اولین ہوگا۔ ان میں سائنس، تاریخ اور اخلاق کا احاطہ کیا جائے گا۔''

''لسان الصدق'' کے شمارہ اپریل اور مئی 1905 میں'' ترقی اردو نمبر 2 ، انجمن ترقی اردو'' کے عنوان سے مولانا آزاد کا ایک مضمون شائع ہوا تھا جس میں اردو ادب میں بے ہودہ کتابوں کی بڑھتی ہوئی تعداد پر تشویش کا اظہار کیا گیا اور مصنفین کے اس رویے کی مذمت کی گئی کہ انھوں نے اپنا قلم عوامی مذاق کے تابع کر دیا، جس کے نتیجے میں عوام روز بروز اسی مذاق کی عادی ہوتے گئے۔ مولانا نے ایک سرکاری رپورٹ کا حوالہ دیا جس کے مطابق 1901 میں اردو کی 457 کتابیں شائع ہوئی تھیں جن میں 231 کتابیں بے ہودہ نظموں، ناولوں اور ادنیٰ درجہ کے مضامین کی تھیں اور تقریباً 100 کتابیں معمولی درجے کی۔ جب کہ صرف 16 کتابیں تاریخ، ادب، سائنس اور صنعت وحرفت کی تھیں۔ مولانا آزاد نے انجمن ترقی اردو کے زیر اہتمام شائع کی جانے والی کتابوں کے لیے پیش آنے والی مشکلات کا اظہار کیا اور بتلایا کہ اگر انجمن عوام کے مذاق کو بالائے طاق رکھ کر اعلیٰ قسم کی کتابیں شائع کرے تو ان کو خریدنے والے کہاں سے ملیں گے۔ چنانچہ اپنے اشاعتی پروگرام کے معیار کو قائم کرنے کے لیے سب سے پہلے انجمن کے پیش نظر عوام کے ذوق کو معیاری بنانا ہوگا، تبھی انجمن اپنے مقاصد میں کامیاب ہوگی۔ انجمن ترقی اردو کی ان مجبوریوں کے ساتھ ساتھ اس کی طبع کردہ کتابوں کی اشاعت پر مولانا اس طرح تنقید کرتے ہیں

'' انجمن ترقی اردو نے جس قسم کی کتابوں کا ترجمہ کیا ہے اور جن کے ترجمے ہو رہے ہیں، ان کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انجمن نے کسی خاص صیغۂ علمی کی اشد ضرورت تسلیم کرکے اس پر توجہ کرنے کی جگہ، مختلف سلسلے جاری کر دیے ہیں، جن سے کام نہایت پریشان ہوگیا ہے۔ ایجوکیشن، کارلائل، رہنمائے ہند، نامہ دانشوران، سولر سسٹم، فلسفۂ حسن، ان چھ کتابوں میں ایک کتاب فن تعلیم سے تعلق رکھتی ہے، ایک کتاب تاریخ کے ساتھ اخلاق پر مشتمل ہے، دو کتابیں مختلف لوگوں کے حالات اور تاریخ کے متعلق ہیں، سولر سسٹم علم ہیئت کا ابتدائی رسالہ ہے۔ صرف آخری کتاب فلسفیانہ مضمون کی ہے۔ بے شک یہ کتابیں اعلیٰ درجہ کی ہیں اور ان کا ترجمہ اردو میں کبھی غیر مفید نہیں ہوسکتا، لیکن اردو کی کم مائیگی اور قوم کی حالت کو دیکھتے ہوئے ہر صائب الرائے شخص یہی کہے گا کہ ابھی صرف سائنٹفک اور فلسفیانہ کتابوں کی اشد ضرورت ہے، ان تمام کتابوں میں صرف تین کتابیں ایجوکیشن، سولر سسٹم، فلسفۂ حسن اس قابل ہیں کہ ان کا ترجمہ اردو میں نہایت ضروری سمجھا جائے، باقی کتابوں کی ترقی اردو کے لیے ابھی ایسی ضرورت نہ تھی کہ ان کو اور فلسفیانہ تصنیفات پر ترجیح دی جاتی۔ ابھی ہم کو یہ سمجھنا چاہیے کہ علم کس چیز کو کہتے ہیں؟ سائنس کیا چیز ہے؟ کس قدر وسیع ہے؟ اور اس کی کتنی شاخیں ہیں؟ دنیا نے اس سے کیا فائدے حاصل کیے؟ اور ہم کیا حاصل کر سکتے ہیں؟ انھی کتابوں کی ہم کو ضرورت ہے، جو ہم کو ان امور کے سمجھنے میں مدد دیں۔ اگر ہم راہ نمایان ہند کے حالات سے واقف ہوگئے، یا ایک بہت بڑی جماعت علما و شعرا کے حالات معلوم ہوگئے تو وہ گو ہمارے لیے مفید ہوں لیکن ابھی وہ ہم کو اس قدر فائدہ نہیں پہنچا سکتے جس قدر کہ سائنس اور فلسفہ سے ہم کو توقع ہے۔ پس انجمن اردو کا کتابوں کو انتخاب کرتے ہوئے اسی نکتہ کو بھلا دینا ہمارے لیے نہایت مضر ہوگا، اگر ایسی فاضل جماعت نے اس نکتہ پر توجہ نہیں کی تو پھر کس سے امید ہوسکتی ہے۔''

''لسان الصدق'' کی اشاعت قریب ڈیڑھ سال تک جاری رہی۔ نومبر 1903 سے مئی 1904 تک یہ ماہنامہ پابندی سے نکلتا رہا۔ آخری تین مشترک شمارے، جون، جولائی، 1904، اگست، ستمبر 1904 اور پھر اپریل، مئی 1905 نکلنے کے بعد یہ رسالہ بند ہوگیا۔ اس کے باوجود اس نے صحافتی دنیا میں بڑی مقبولیت حاصل کی۔ اس کے معیار کی بلندی اور طرز تحریر کی دلکشی سے لوگوں نے مولانا آزاد کے بارے میں ایک معمر اور بہت ہی منجھے ہوئے مدیر کا تاثر لیا۔ چنانچہ مولانا کی عزت، شہرت اور مقبولیت میں کافی اضافہ ہوا اور وہ اکثر علمی، ادبی جلسوں اور تہذیبی پروگراموں میں تقریر کے لیے بلائے جانے لگے۔ تقریر میں خطیبانہ لہجہ سامعین کو دم بخود کر دیتا اور انھیں بڑا تعجب ہوتا کہ اتنی کم عمری میں ''لسان الصدق'' جیسے موقر رسالے کی ادارت کے فرائض وہ کیسے انجام دے پاتے تھے۔

''لسان الصدق'' کے شمارہ اگست اور ستمبر 1904 میں علی محمود صاحب، بانکی پور کا ایک مضمون '' زبان کا قانون'' شائع ہوا جس سے پہلے مولانا آزاد کا ایک نوٹ بعنوان ''دیسی اور ولایتی الفاظ'' تھا۔ مضمون نگار کا مطمح نظر یہ تھا کہ اردو میں کثرت سے انگریزی الفاظ کے استعمال کا رجحان، زبان کی شیرینی اور فصاحت کے لیے مضر ثابت ہوگا۔ موصوف نے اردو میں استعمال کیے جانے والے انگریزی الفاظ کی پانچ قسمیں قرار دی تھیں اور چند ایک مثالوں کے ذریعے یہ واضح کیا تھا کہ کس قسم کے الفاظ کو اردو میں استعمال کرنا چاہیے اور کس قسم سے احتراز۔ مولانا آزاد نے اپنے نوٹ میں مضمون نگار سے اتفاق کرتے ہوئے چند سوالات اٹھائے تھے

'' اب دیکھنا یہ ہے کہ ہمارے پاس وہ کون سا معیار ہے جس سے ہم انگریزی کے ان الفاظ میں جن کا استعمال غیر ضروری ہے اور ان الفاظ میں جن کا استعمال ضروری ہے، ایک حد فاصل قرار دے سکیں، کیوں کہ یہ تو ظاہر ہے کہ ایک زبان دوسری زبان سے فائدہ حاصل کرنا چاہے گی تو اس کی علمی اصطلاحات اور وسیع الفاظ کا اس پر ضرور اثر پڑے گا اور ان کے استعمال پر مجبور

ہوگی۔ اس لیے ایک ایسا معیار ضرور ہونا چاہیے جس سے ضروری اور غیر ضروری الفاظ میں امتیاز کرسکیں۔"

اس نوٹ میں مولانا آزاد نے بعض انگریزی الفاظ و اصطلاحات جن میں سائنسی اصطلاحات بھی شامل ہیں، کے متبادلات پر بحث کی ہے۔ اس سلسلے میں انھوں نے کہا ہے کہ "اگرچہ انگریزی کی اصطلاحات کے متبادلات اردو زبان میں مل جاتے ہیں لیکن ان کی معنوی جامعیت کا بدل ثابت نہیں ہوتے اور ان میں وہ بات پیدا نہیں ہوتی جو انگریزی الفاظ میں موجود رہتی ہے۔"

چنانچہ سائنس کی ایک اہم شاخ کیمسٹری کے بارے میں وہ لکھتے ہیں

"بعض الفاظ ایسے ہیں کہ اگرچہ اردو میں ان کے لیے کافی الفاظ موجود ہیں لیکن قائل وہ الفاظ کہہ کر جس مفہوم کو سامع کے ذہن نشین کرنا چاہتا ہے، اردو الفاظ اس مفہوم کے ادا کرنے سے قاصر ہیں اور ممکن ہے کہ بجائے اصلی مفہوم کے سامع ان الفاظ سے کسی دھوکہ میں پڑ جائے مثلاً انگریزی کا لفظ کیمسٹری ہے۔ جس مخزن سے انگریزی میں یہ لفظ آیا ہے، اسی مخزن سے عربی میں اور پھر عربی سے اردو میں کیمیا آیا ہے۔ اب دیکھو اگر کیمیا کا لفظ استعمال کیا جائے تو ممکن نہیں کہ اس سے سامع علم کیمسٹری کا وسیع مفہوم سمجھ سکے۔ بلکہ اس کا خیال مشرق کی اس غلط فہمی کی طرف جائے گا جس کا نام کیمیا رکھا گیا ہے۔ برخلاف اس کے اگر کیمسٹری کا لفظ استعمال کیا جائے تو وہ غلط فہمی کبھی پیدا نہیں ہوسکتی۔"

اس تمام بحث سے مولانا آزاد کا مطمح نظر صاف ظاہر ہوجاتا ہے کہ انگریزی کی وہ سائنسی اصطلاحیں جو رواج پا چکی ہیں ان کو جوں کا توں برقرار رکھنے اور استعمال کرنے کی ضرورت ہے، بغیر اس بات کی کوشش کیے کہ کوئی غیر مانوس اردو لفظ کو اس کی بجائے اصطلاح کے طور پر پیش کیا جائے۔ ہاں سائنس کی ایسی انگریزی اصطلاحیں جو اردو والوں کے لیے غیر مانوس ہیں ان کے تئیں اردو متبادل اصطلاحوں کا مدون کرنا حق بجانب ہوگا۔

لسان الصدق سے متعلق عبدالقوی دسنوی لکھتے ہیں :

"اس کے معتبر مضامین، فکر انگیز تحریریں، وقتی مسائل سے دلچسپی، سماجی خرابیوں کی طرف توجہ، علمی مذاق کی تشریح، معیاری تبصرے، عالمانہ نقد و نظر کچھ اس انداز سے سامنے آئے کہ ہر طرف سے واہ واہ اور نعرۂ تحسین بلند ہوا۔ معاصر اخبارات اور رسائل میں اس کے متعلق چرچے ہونے لگے اور اس کی تعریف اور توصیف کی جانے لگی، اہل ذوق نے شوق سے اس کا مطالعہ کیا، اس سے دلچسپی لی اور اسے پسند کیا۔

اس قدر مقبولیت کے باوجود حالات نے کچھ ایسی صورت پیدا کردی کہ یہ رسالہ اپنے ابتدائی سفر ہی میں ہمیشہ کے لیے بند ہوگیا۔"

□□□

رابطہ:

Controller of Examinations
Maulana Azad National Urdu University
Gachibowli, Hyderabad-500032 (A.P)

انیس کے مرثیے

مرتبہ: بیگم صالحہ عابد حسین

میر انیس کے مرثیوں کے متعدد مجموعے شائع ہوئے ہیں لیکن یہ ان کے پورے کلام کو محیط نہیں اور ان میں بیشتر میں صحت متن کا بھی زیادہ خیال نہیں رکھا گیا ہے۔ یہ کتاب بیگم صالحہ عابد حسین نے تدوین کے جدید اصولوں کو سامنے رکھتے ہوئے دو جلدوں میں مرتب کی ہے جس میں انیس کے تمام دستیاب مرثیے شامل ہیں۔ ہر جلد کے ساتھ مفصل مقدمہ بھی ہے اور ایسے الفاظ کی فرہنگ بھی جو اب کم مستعمل ہیں یا معنوی تغیر سے دوچار ہوئے ہیں۔

جلد اول، دوسرا ایڈیشن: صفحات: 540، قیمت :-/36 روپے
جلد دوم، دوسرا ایڈیشن: صفحات: 575، قیمت :-/40 روپے

کاشف الحقائق

مصنف: سید امداد امام اثر

سید امداد امام اثر کی یہ بلند پایہ تصنیف دو حصوں میں منقسم ہے۔ پہلے حصے میں یوروپی ادبیات کے حوالے سے گفتگو کی گئی ہے اور دوسرے حصے میں مشرقی ادبیات کی خصوصیات واضح کی گئی ہیں۔ شعر و ادب اور دیگر فنون لطیفہ میں جو باہمی قربت و موانست ہے، اس کا بھی ذکر ہے۔ دوسرے حصے میں اردو شاعری کی تمام اصناف اور ہر صنف کے نمائندہ شاعروں کا تفصیلی بیان ہے جو تجزیاتی انداز کا حامل ہے۔ اس ایڈیشن کی ایک خصوصیت پروفیسر وہاب اشرفی کا بسیط مقدمہ ہے جس میں انھوں نے کتاب کے تمام اہم پہلوؤں کا جائزہ لیا ہے۔

دوسرا ایڈیشن: صفحات:740، قیمت -/145 روپے

نوٹ: طلبہ کے لیے 45% اور اساتذہ کے لیے 40% کی خصوصی رعایت۔ تاجران کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر کے پورم، نئی دہلی-110 066

مشتاق احمد

مولانا ابوالکلام آزاد کی عصری معنویت

مولانا ابوالکلام آزاد ہماری جنگ آزادی کے ایک بے خوف مشعل بردار ہی نہ تھے بلکہ ان کی پہلو دار شخصیت کا ہر پہلو تابناک تھا۔ ملک کی آزادی کے لیے انگریزوں کے خلاف جنگ لڑنے والے مجاہدین آزادی کے لیے وہ ایک حوصلہ مند سپہ سالار تھے تو مسلم مذہبی حلقوں کے لیے وہ ایک تعمیری سوچ اور فکر رکھنے والے شعلہ بیان مقرر اور بیدار ذہن عالم دین تھے۔ وہ مسلمانوں کی نئی نسل کے لیے قدیم تاریخ اور تہذیب و تمدن سے روشناس کرانے والے ایک مورخ تھے تو کانگریس پارٹی کے لیے اندھیرے میں چراغ کی حیثیت رکھتے تھے۔ انھوں نے زندگی کے آخری لمحے تک ملک و قوم کی بے لوث خدمت کر کے یہ ثابت کر دیا کہ وہ ہندوستان کے ایک سچے سپوت ہیں۔

مولانا آزاد ایک حساس ذہن کے مالک تھے۔ انھوں نے ہندوستانی معاشرے کے معاملات و مسائل کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ انھوں نے ہندوستانی عوام کی زندگی کو قریب سے دیکھا اور سمجھا تھا۔ اس لیے وہ عوام کے اندر سوئی ہوئی انسانیت کو جگانا چاہتے تھے۔ کیوں کہ ان کا خیال تھا کہ جب تک عوام کے اندر کی چنگاری کو شعلہ نہیں بنایا جائے گا اس وقت تک یہ ملک غلامی کے طوق سے نجات حاصل نہیں کر سکتا اور اس کے لیے وہ ہندو مسلم اتحاد کے نہ صرف قائل تھے بلکہ وہ اسے حصول آزادی کے لیے لازمی قرار دیتے تھے۔ ان کے نزدیک مذہب، ذات پات، فرقہ، قوم اور کسی طرح کی گروہ بندی کی حب الوطنی کے سامنے کوئی حیثیت نہ تھی۔ 1923 کے انڈین نیشنل کانگریس کے خصوصی اجلاس دہلی میں انھیں سب سے کم عمر صدر کی حیثیت سے خطاب کرنے کا موقع ملا تو انھوں نے ہندو مسلم اتحاد کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے کہا کہ:

''میں نے آپ کا اس قدر وقت در و دیوار کی فکر میں لے لیا حالانکہ ابھی یہ بات باقی ہے کہ ہماری جدوجہد کی بنیاد کا کیا حال ہے۔ میرا اشارہ ہندو مسلم اتحاد کی طرف ہے۔ یہ ہماری تعمیرات کی وہ پہلی بنیاد ہے جس کے بغیر نہ صرف ہندوستان کی آزادی بلکہ ہندوستان کی وہ تمام باتیں جو کسی ملک کے زندہ رہنے اور ترقی کرنے کے لیے ہو سکتی ہیں، محض خواب و خیال ہیں۔ صرف یہی نہیں کہ اس کے بغیر ہمیں قومی آزادی نہیں مل سکتی بلکہ اس کے بغیر ہم انسانیت کے ابتدائی اصول بھی اپنے اندر نہیں پیدا کر سکتے۔ آج اگر ایک فرشتہ آسمان کی بلندیوں سے اتر آئے اور قطب مینار پر کھڑے ہو کر یہ اعلان کر دے کہ سوراج 24 گھنٹے کے اندر مل سکتا ہے، بشرطیکہ ہندوستان ہندو مسلم اتحاد سے دست بردار ہو جائے تو میں سوراج سے دست بردار ہو جاؤں گا، مگر اس سے دست بردار نہ ہوں گا کیوں کہ اگر سوراج کے ملنے میں تاخیر ہوئی تو یہ ہندوستان کا نقصان ہوگا۔ لیکن اگر ہمارا اتحاد جاتا رہا تو یہ عالم انسانیت کا نقصان ہے۔ (خطبات آزاد۔ مرتبہ مالک رام صفحہ 5-204)

مندرجہ بالا اقتباس مولانا آزاد کی سیاسی بصیرت اور دانشورانہ فکر کا غماز ہے کہ وہ آزادی ملنے میں تاخیر کو قبول کر سکتے ہیں۔ لیکن ہندو مسلم اتحاد کے سوال پر کسی طرح کی مفاہمت کے روادار نہیں کیوں کہ ان کی نگاہ میں فرقہ وارانہ نفاق انسانیت کے لیے تباہ کن ثابت ہو سکتا ہے۔

مولانا آزاد کا خیال تھا کہ اگر مسلمان جنگ آزادی کے مرکزی دھارے سے ذرا بھی الگ ہٹتے ہیں تو اس سے ملک اور ملت دونوں کا بڑا نقصان ہوگا۔ اور ملک میں نفرت کی ایک دیوار کھڑی ہو جائے گی۔ انھوں نے ایک طرف مسلمانوں کو قدم قدم پر ہوشیار کیا کہ وہ کسی طرح کے بہکاوے میں نہ آئیں اور اپنے ہم وطنوں کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر انگریزی حکومت کو ملک سے نکال باہر کرنے میں ہر محاذ پر ساتھ ساتھ رہیں تو دوسری طرف انھوں نے کانگریس کو بھی خبردار کیا کہ مسلمانوں کے جائز حقوق کو کسی طور بھی نظر انداز نہیں کیا جائے۔ انھوں نے مسلمانوں سے اپیل کی کہ وہ اپنے سیاسی مطالبوں کو منوانے کے لیے کسی طرح بھی نفاق کی راہ اختیار نہ کریں۔ آل انڈیا خلافت کانفرنس کانپور، 1925 کے اپنے صدارتی خطبے میں انھوں نے کہا تھا کہ:

''موجودہ صورت حال کی بدقسمتی اس کام میں کتنی ہی دشواریاں پیدا کر دے لیکن وہ تیار نہیں کہ اس نصب العین سے دست بردار ہو جائے۔ وہ مسلمانوں کے جماعتی حقوق و فوائد کا تحفظ ضروری سمجھتا ہے لیکن اس طریق عمل سے انکار کرتا ہے کہ مسلمان ہندوؤں کے طرز عمل سے روٹھ کر اجنبی حکومت کی آڑ پکڑ لیں۔ اور ان کی ہستی ہمیشہ ملک کی قسمت کے لیے ایک دھمکی کی طرح استعمال کی جائے۔ اگر ہندوؤں سے انھیں منصفانہ طرز عمل کا مطالبہ کرنا ہے تو پوری قوت سے کرنا چاہیے۔ لیکن ساتھ ہی یہ ضروری ہے کہ ہماری باہمی آویزش ملکی جنگ کے میدان سے ہمیشہ الگ رہے۔''

مولانا آزاد ایک مذہبی انسان تھے اور وہ ایک سچا مسلمان ہونے پر فخر کرتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ مذہب، قومیت کے تصور میں کبھی دیوار نہیں بنتا بلکہ مذہب انسان کے اندر تعمیری فکر پیدا کرتا ہے۔ ان کا خیال تھا کہ ان کا مسلمان ہونا ان کے لیے کسی طرح کی مشکل پیدا نہیں کرتا۔ ان کے ایک خطبے ''مسلمان اور متحدہ قومیت'' سے اقتباس ملاحظہ کیجیے:

''میں مسلمان ہوں اور فخر کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ مسلمان ہوں۔ اسلام کی تیرہ سو برس کی شاندار روایتیں میرے ورثے میں آئی ہیں۔ میں تیار نہیں کہ اس کا کوئی چھوٹے سے چھوٹا حصہ بھی ضائع ہونے دوں۔ اسلام کی تاریخ، اسلام کے علوم وفنون، اسلام کی تہذیب، میری دولت کا سرمایہ ہے، اور میرا فرض ہے کہ اس کی حفاظت کروں۔ بحیثیت مسلمان ہونے کے میں مذہبی اور کلچرل دائرے میں اپنی ایک خاص ہستی رکھتا ہوں، اور میں برداشت نہیں کر سکتا کہ اس میں کوئی مداخلت کرے۔ لیکن ان تمام احساسات کے ساتھ میں ایک اور احساس بھی رکھتا ہوں جسے میری زندگی کی حقیقتوں نے پیدا کیا ہے۔ اسلام کی روح مجھے اس سے نہیں روکتی۔ وہ اس راہ میں میری رہنمائی کرتی ہے۔ میں فخر کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ میں ہندوستانی ہوں۔ میں ہندوستان کی ایک ناقابل تقسیم متحدہ قومیت کا ایک عنصر ہوں۔ میں اس متحدہ قومیت کا ایک ایسا عنصر ہوں جس کے بغیر اس کی عظمت کا ہیکل ادھورا رہ جاتا ہے۔ میں اس کی تکمیل کا ایک ناگزیر عامل ہوں۔ میں اپنے اس دعوے سے کبھی دست بردار نہیں ہو سکتا۔''

مولانا آزاد مذہب کو کسی طور پر بھی ذہنی ارتقا کے لیے مضر تصور نہیں کرتے تھے بلکہ ان کا خیال تھا کہ مذاہب بچوں کے اندر اخلاقی اقدار پیدا کرتے ہیں اور انسان دوستی اور حب الوطنی کا جذبہ پیدا کرتے ہیں۔

1947 میں ملک آزاد ہوا مگر اب وہ ہندوستان نہیں رہا جس ہندوستان کی آزادی کے لیے مولانا آزاد نے اپنا سب کچھ کھویا تھا۔ ملک کی تقسیم نے ان کے ذہن و دل کو متزلزل کر دیا تھا۔ لیکن ایسے نازک حالات میں بھی ان کے قدم نہیں ڈگمگائے۔ انھوں نے صبر وتحمل کے ساتھ حالات کا مقابلہ کیا۔ انھوں نے مسلمانوں کو جلاوطنی علاحدگی پسندی اور مایوسیوں اور محرومیوں کو ترک کر کے اپنے ہم وطنوں کے ساتھ جینے اور مرنے کی تلقین کی۔ ترک وطن کرنے والے قافلے سے خطاب کرتے ہوئے انھوں نے اکتوبر 1947 جو کچھ کہا تھا، آج بھی اس کی اہمیت اپنی جگہ برقرار ہے کہ جو لوگ اپنے ملک کو چھوڑ کر پاکستان گئے، وہ آزادی کے 59 برسوں کے بعد بھی وہاں اپنے دامن سے مہاجر ہونے کا داغ نہیں مٹا پائے ہیں۔ کاش! اس وقت وطن چھوڑ کر جانے والے قافلوں نے مولانا آزاد کی دور اندیشیوں کو سمجھا ہوتا اور ان کے دل کی پکار سنی ہوتی تو آج ہندوستان کا نقشہ ہی کچھ اور ہوتا۔ مولانا آزاد کے اس تاریخی خطبے کا لفظ لفظ آج بھی اپنی معنویت رکھتا ہے۔

''یہ دیکھو، مسجد کے بلند مینار تم سے اچک کر سوال کرتے ہیں کہ تم نے اپنی تاریخ کے صفحات کو کہاں گم کر دیا؟ ابھی کل کی بات ہے کہ جمنا کے کنارے تمھارے قافلوں نے وضو کیا تھا۔ اور آج تم ہو کہ تمھیں یہاں رہتے ہوئے خوف محسوس ہوتا ہے۔ حالانکہ دہلی تمھارے خون سے سینچی ہوئی ہے ۔ وہ تمھارے ہی اسلاف تھے جو سمندروں میں اتر گئے، پہاڑوں کی چھاتیوں کو روند ڈالا، بجلیاں آئیں تو ان پر مسکرا دیے، بادل گرجے تو قہقہوں سے جواب دیا، صرصر اٹھی تو اس کا رخ پھیر دیا، آندھیاں آئیں تو ان سے کہا کہ تمھارا راستہ یہ نہیں۔ یہ ایمان کی جاں کنی ہے کہ شہنشاہوں کے گریبانوں سے کھیلنے والے آج خود اپنے گریبانوں سے کھیلنے لگے۔ اور خدا سے اس درجہ غافل ہو گئے جیسے اس پر کبھی ایمان ہی نہیں تھا۔'' (خطبات آزاد۔ مالک رام صفحہ 340)

مولانا آزاد، آزاد ہندوستان کے پہلے وزیر تعلیم تھے۔ اس وقت ملک کے حالات کیسے تھے اس تلخ حقیقت سے ہم آپ خوب اچھی طرح واقف ہیں۔ ویسے نازک حالات میں بھی مولانا آزاد نے جو نظریہ تعلیم پیش کیا۔ وہ آج بھی اپنی معنویت رکھتا ہے۔ آج جب ہم انفارمیشن ٹیکنالوجی کے دور میں جی رہے ہیں تو جدید علوم وفنون کو اپنانے کی دوڑ میں شامل ہونا چاہتے ہیں۔ لیکن مولانا آزاد نے اس پر آشوب دور میں ہی ''میکالے'' کے نظام تعلیم کو ترک کر کے جدید نظام تعلیم کو اپنانے کی وکالت کی تھی۔ انھوں نے 18 فروری 1949 کی ایک پریس کانفرنس میں کہا تھا کہ ''میکالے کا مقصد صرف برطانوی خیر خواہ تیار کرنا تھا لہٰذا ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ موجودہ نظام تعلیم ہماری قومی ضروریات کس حد تک پورا کرتا ہے۔''

آج ہمارے ماہرین تعلیم اس بات پر زور دیتے ہیں کہ بچوں کی تعلیم کا ذریعہ اس کی مادری زبان ہو۔ مولانا آزاد نے 1949 میں ہی اس بات پر زور دیا تھا کہ تعلیم کا ذریعہ ملکی زبان ہونا چاہیے۔ واضح ہو کہ اس وقت قومی زبان ہندوستانی قرار پائی تھی۔ لہٰذا انھوں نے کہا تھا کہ ''اب وقت آگیا ہے کہ ملک میں ہر قسم کی تعلیم دیسی زبانوں ہی میں دیے جانے کا تجربہ کیا جائے یہ پسندیدہ امر ہے کہ ہر ہندوستانی دیوناگری اور اردو دونوں رسم الخط سیکھے۔''

مولانا آزاد کا مطالعہ بہت وسیع تھا، خاص طور سے قدیم ادب، عربی، فارسی اور سنسکرت زبان و ادب پر عبور حاصل تھا۔ وہ ہر وقت جدید سے جدید ترین سائنسی معلومات سے آگاہی حاصل کرنے کے آرزو مند رہتے تھے۔ وہ عصری فکری میلانات اور سائنسی رجحانات اور افکار سے نہ صرف باخبر رہتے تھے بلکہ ان کے اثرات کا پوری طرح تجزیہ کرتے تھے۔ وہ مذہب، فلسفے اور تاریخ کے تاریک سے تاریک گوشوں تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش میں

رہتے تھے اور اس میں انھیں بڑی کامیابی بھی ملی تھی۔ ان کو ادب سے والہانہ عشق تھا۔ وہ ادب برائے زندگی کے قائل تھے۔ صحافت کے میدان میں ان کے قلم کی جادوگری نے جس طرح انقلاب کی چنگاری کو شعلہ بنانے کا کام کیا تھا کہ اس میدان میں بھی وہ یکتا رہے۔ ان کے طرزِ تحریر نے اردو صحافت کو ایک معیار بخشا۔

مولانا آزاد کی فکری معنویت ہر زمانے میں برقرار رہے گی۔ ایسے نابغۂ روزگار صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں۔ مولانا آزاد کی علمی صلاحیت اور فکری گہرائی کا اعتراف کرتے ہوئے پنڈت جواہر لال نہرو نے جو کچھ لکھا تھا اس کا ایک ایک لفظ آبِ زر سے لکھے جانے اور ہمیشہ یاد رکھنے کے قابل ہے:

''بعض اعتبار سے ان کی طرزِ فکر بنیادی طور پر جدید تھی اور بعض دوسری باتوں میں ان کا ماضی سے بڑا گہرا رشتہ تھا اور وہ اس دور کے شعور کا عکس تھے جسے روشن خیالی کا دور کہا جاتا ہے۔ مجموعی طور پر وہ ایک ایسے غیر معمولی فرد تھے جنھوں نے اس مقصد کو جس کے لیے وہ عمر بھر کوشاں رہے ایک امتیازی شان بخشی اور وہ بھی کچھ اس ڈھنگ سے جس کی کوئی ہمسری نہیں کر سکتا۔ پرانا نظام بدلتا ہے اور ہم اسے واپس نہیں لا سکتے۔ لیکن ہم اس سے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔ اس طرح ہم مولانا آزاد کی یاد دلوں میں تازہ کرتے ہوئے ان کی زندگی اور ان کی تعلیمات سے ایک بڑا سبق سیکھ سکتے ہیں۔''

❑❑❑

رابطہ:

Department of Urdu
Millat College
Darbhanga-846004
(Bihar)

شعر، غیر شعر اور نثر

مصنف: شمس الرحمٰن فاروقی

جناب شمس الرحمٰن فاروقی کے خیال انگیز مضامین کا یہ مجموعہ پہلی بار 1973 اور دوسری بار 1998 میں شائع ہوا تھا۔ اس میں شامل مضامین نے تفہیم شعر و ادب کی نئی راہیں کھولیں۔ یہ اس اہم کتاب کا تازہ ترین ایڈیشن ہے جس میں ''پس نوشت: آج یہ کتاب'' کے عنوان سے ایک نئے مضمون کا اضافہ بھی کر دیا گیا ہے۔ جدید ادب اور جدیدیت کی تفہیم نیز کلاسیکی ادب کی فہم و بازیافت دونوں کے لیے اس کتاب کا مطالعہ ضروری ہے۔

صفحات: 528، قیمت -/228 روپے

کلیاتِ مصحفی (جلد اوّل تا چہارم)

بہ تصحیح: نثار احمد فاروقی

غلام ہمدانی مصحفی کا وطن امروہہ تھا لیکن ان کی زندگی کا بیشتر حصہ دہلی اور لکھنؤ میں گزرا اور ان دونوں بڑے ادبی مراکز سے کسب فیض کر کے انھوں نے ایک نیا رنگ سخن ایجاد کیا جو ان کی پہچان بنا۔ مصحفی بڑے پرگو شاعر تھے۔ جناب نثار احمد فاروقی نے جو مصحفی کے ہم وطن بھی تھے ان کی کلیات آٹھ جلدوں میں مرتب کر دیا ہے، جن میں سے چار شائع ہو چکے ہیں۔

جلد اوّل۔ صفحات: 495، قیمت: -/220
جلد دوم۔ صفحات: 369، قیمت: -/154
جلد سوم۔ صفحات: 320، قیمت: -/181
جلد چہارم۔ صفحات: 389، قیمت: -/216

توبۃ النصوح

مصنف: ڈپٹی نذیر احمد

''توبۃ النصوح'' اردو کے پہلے ناول نگار ڈپٹی نذیر احمد کا تیسرا ناول ہے جو پہلی بار 1877 میں شائع ہوا۔ اصلاح معاشرہ کے مقصد سے لکھے گئے اس ناول کو کلاسک کا درجہ حاصل ہے اور یہ ملک کی تمام یونیورسٹیوں اور کالجوں کے نصاب میں شامل ہے۔ ناول کا یہ ایڈیشن اتر پردیش اردو اکادمی کے 1983 میں شائع کردہ نسخے پر مبنی ہے۔

صفحات: 175، قیمت: -/75 روپے

ابن الوقت

مصنف: ڈپٹی نذیر احمد

ڈپٹی نذیر احمد نے اس ناول میں انگریزی تہذیب کی اندھی تقلید اور اس سے پیدا ہونے والی خرابیوں کو موضوع بنایا ہے۔ ابن الوقت، نوبل صاحب اور حجۃ الاسلام کے کرداروں کی مدد سے ناول نگار نے انیسویں صدی کے ہندوستانی مسلم معاشرے کی عکاسی کی ہے جو اس عبوری دور سے گزر رہا تھا۔ ناول کا متن اتر پردیش اردو اکادمی کے 1973 میں شائع کردہ متن پر مبنی ہے۔

صفحات: 225، قیمت: -/91 روپے

نوٹ: طلبہ کے لیے 45% اور اساتذہ کے لیے 40% کی خصوصی رعایت۔ تاجرانِ کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر. کے. پورم، نئی دہلی-110 066

سید احسان الرحمن

نجیب محفوظ

نوبل انعام یافتہ مصری ادیب نجیب محفوظ کا نام عالمی پیمانے پر ہر ادبی حلقے میں بلاتفریق مذہب وملت نہایت ادب واحترام کے ساتھ لیا جاتا ہے۔ ادبی دنیا میں نجیب محفوظ نے یہ مقام صرف اپنی کوششوں سے حاصل کیا ہے کیونکہ راقم السطور کی معلومات کے مطابق ان کے خاندان میں پچھلی کئی پشتوں سے نہ تو کوئی ادیب گزرا ہے، نہ شاعر اور نہ کوئی عالم دین جس نے ان کی پڑھنے لکھنے پر ہمت افزائی کی ہو۔

اگرچہ نجیب محفوظ اپنے خاندان اور اپنے خاندان کے افراد کے بارے میں بات کرنے سے ہمیشہ کتراتے تھے اور جب بھی انھوں نے کچھ کہا تو اتنا معمولی کہ اس سے ان کے خاندان کے افراد کے بارے میں اندازہ لگانا مشکل ہے۔ پھر بھی ان کے کچھ قریبی دوستوں اور ہم کاروں نے ان کے خاندان کے بارے میں کچھ بنیادی باتیں اور معلومات تحریر کی ہیں جو ادھر ادھر بکھری ہوئی ہیں۔ ان کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے والد ایک سرکاری ملازم تھے جو قاہرہ میں ایک سرکاری دفتر میں ملازمت کرتے تھے۔ معمولی سی تنخواہ تھی۔ بشمول نجیب محفوظ ان کے تین لڑکے اور چار لڑکیاں تھیں۔ ایک اطلاع کے مطابق نجیب محفوظ گھر میں سب سے چھوٹے تھے۔ ان کے اور ان کے بڑے بھائی کی عمر میں تقریباً دس بارہ سال کا فرق تھا۔

نجیب محفوظ دسمبر 1911 میں قاہرہ کے ایک مشہور محلہ الجمالیہ میں پیدا ہوئے۔ ان کا بچپن اسی محلے کی گلیوں اور کوچوں میں گزرا جہاں انھوں نے اپنی زندگی کے بہترین تیرہ سال گزارے تھے۔ ان گلی کوچوں سے ان کو بے حد محبت تھی۔ اس کے بارے میں وہ خود اس طرح گویا ہیں: میں جمالیہ کو کبھی نہیں بھلا سکا۔ یہی نہیں بلکہ میری اکثر کہانیاں اور ناول اسی محلے کی دین ہیں۔ ان کا ورود مجھ پر اس وقت ہوتا تھا، جب میں یہاں آکر قہوہ خانے میں بیٹھا کرتا تھا۔''

نجیب محفوظ کو بچپن سے ہی پڑھنے لکھنے کا شوق تھا۔ جب اسکول میں تھے تو اپنے امیر دوستوں سے قصے کہانیوں کی کتابیں مستعار لے کر پڑھا کرتے تھے۔ اپنی اسکولی تعلیم کے دوران وہ جاسوسی ناولوں میں دلچسپی لینے لگے۔ آہستہ آہستہ تاریخی ناولوں تک ان کی رسائی ہوئی۔ وہ دل کے بہت صاف، نیک طبیعت اور نرم دل تھے۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ یہ سب محض کہانیاں ہیں، جذباتی واقعات پڑھنے کے دوران اکثر رو دیا کرتے تھے۔ یہ جاسوسی، تاریخی اور مہم جویانہ ناول اکثر وہ انگریزی یا فرانسیسی میں ہی پڑھتے تھے اور کبھی کبھی ترجمہ شدہ ناول بھی پڑھتے تھے۔ گرمیوں کی طویل چھٹیوں کے دوران وہ اکثر ان ناولوں کو ذہن میں رکھ کر خود کچھ نہ کچھ لکھنے کی کوشش کرتے تھے۔ ان میں کچھ تصرف بھی کرتے تھے اور عبارت کے خاتمے پر بقلم نجیب محفوظ لکھ کر بہت خوشی محسوس کرتے تھے۔

1934 میں انھوں نے قاہرہ یونیورسٹی جو ان کے زمانے میں ملک فؤاد یونیورسٹی کے نام سے جانی جاتی تھی۔ فلسفہ میں بی.اے کرنے کے بعد ایم اے فلسفہ میں داخلہ بھی لیا لیکن جلد ہی وہ اس سے ادب گئے اور تعلیمی سلسلہ منقطع کر دیا۔ ترک تعلیم کے بعد انھوں نے 1936 سے 1939 تک قاہرہ یونیورسٹی کے اداراتی شعبے میں خدمات انجام دیں۔ 1939 میں ہی ان کو سرکاری ملازمت مل گئی اور وزارت اوقاف میں ان کا تقرر ہوا۔ چند سال یہاں کام کرنے کے بعد ان کو مصری سینما کے شعبے میں منتقل کر دیا گیا جہاں انھوں نے شعبے کے ڈائرکٹر کی حیثیت سے ایک لمبی مدت تک کام کیا۔ اسی کے بعد ملازمت کے آخری ایام میں 1969 میں وزارت ثقافت میں ان کا تبادلہ کر دیا گیا جہاں تقریباً تین سال کام کرنے کے بعد 1971 میں سبک دوش ہوئے۔ اس وقت ان کی عمر ساٹھ سال تھی۔ سرکاری ملازمت سے سبک دوش ہونے کے بعد ''الاہرام'' اخبار کے دفتر میں ان کو مشیر کی حیثیت سے مدعو کیا گیا۔ الاہرام میں شروع کے دنوں میں انھوں نے سیاسی کالم لکھنا شروع کیا لیکن حکمرانوں کو ان کی نکتہ چینی پسند نہ تھی، لہٰذا ان سے درخواست کی گئی کہ وہ اجتماعی موضوعات پر مضامین لکھیں۔ ''الاہرام'' سے وہ اپنی آخری سانس تک وابستہ رہے۔

انھوں نے سات آٹھ سال کی عمر سے ہی لکھنا شروع کر دیا تھا۔ ابتدائی دنوں کے بارے میں انھوں نے لکھا ہے کہ: وہ لکھتے تھے اور نظرثانی کرتے تھے۔ کبھی وہ اپنی تحریروں کو ناپختہ پاکر خود ہی پھاڑ دیا کرتے تھے اور کبھی وہ اوراق ان کے دل کی تڑپ لیے میز پر پڑے اپنے انجام کا انتظار کرتے رہتے تھے۔ ان کی سب سے پہلی کوشش جو لوگوں کے سامنے آئی وہ قدیم مصری تہذیب پر ایک انگریزی کتاب کا ترجمہ تھا۔ اس کتاب کے منظرعام پر آنے

کے بعد ان میں ایک نئے جوش، ایک نئی ہمت نے جنم لیا۔ اس ترجمہ کے بعد ان میں یہ احساس پیدا ہوا کہ وہ لکھ سکتے ہیں۔ آہستہ آہستہ ان کا تعلق اس وقت کے بڑے ادیب اور صحافی سلامہ موسیٰ سے ہوا اور نجیب نے اپنی تحریریں سلامہ موسیٰ کو (اصلاح اور مشورے کی غرض سے) دکھانی شروع کر دیں۔ سلامہ موسیٰ نہ صرف ایک بڑے ادیب تھے بلکہ ایک نہایت ہی نیک دل انسان بھی تھے۔ انھوں نے اس نوجوان قلمکار کی خوب ہمت افزائی کی۔ انھوں نے نجیب کی ہر تحریر، ہر کہانی کو بہت غور سے پڑھا اور انھیں اپنے قیمتی مشوروں سے نوازا لیکن انھوں نے ان کی کسی کہانی کو اس لائق نہیں سمجھا کہ اس کو اپنے رسالہ ''المجلۃ الجدیدۃ'' میں جگہ دیں۔ اس کے باوجود نجیب دل برداشتہ نہیں ہوئے بلکہ اپنی کوشش میں لگے رہے اور مسلسل لکھتے رہے۔ زندگی کے ایک موڑ پر جب انھوں نے والٹر اسکاٹ کے تاریخی ناولوں کا مطالعہ کیا تو انھوں نے بھی تاریخی ناول لکھنے کا عزم کیا۔ انھوں نے فیصلہ کیا کہ وہ ہر سال ایک تاریخی ناول لکھیں گے اور اس طرح تیس کی گنتی پوری کریں گے۔ اس سلسلے کی پہلی کڑی تھا ان کا ناول ''عبث الاقدار''، یعنی زندگی کا کھیل (میرے ترجمے کے مطابق) جب سلامہ موسیٰ کو انھوں نے اپنا یہ ناول نظر ثانی کرنے کے لیے دیا تو سلامہ کو اس میں نجیب کا روشن مستقبل نظر آیا۔ انھوں نے یہ ناول اپنے ادارہ سے شائع کیا۔ اس کے بعد نجیب نے ''رادوبیس'' نام کا ناول لکھا۔ رادوبیس فرعونی محل میں ایک خادمہ تھی۔ یہ نہایت ہی حسین و جمیل اور مہذب عورت تھی۔ اس کی محبت میں حکمراں نے کس طرح تخت حکومت کو نظر انداز کیا، یہ تمام روداد اس ناول میں پیش کی گئی ہے۔ تیسرا تاریخی ناول ''کفاح طیبہ'' یعنی طیبہ (تھیبہ) کی کوشش ہے۔ تھیبہ جنوبی مصر میں ایک شہر کا نام ہے جو کئی بار لٹا اور کئی بار بسا۔ اس ناول میں نجیب نے قدیم مصری تاریخ کو موضوع بنا کر زندگی کے سیاسی پہلوؤں کو بھی اجاگر کیا ہے۔ لیکن اس سلسلے کے طے شدہ تیس ناولوں کو تین کے بعد صفر لگا کر نجیب نے گنتی پوری کر دی، انھوں نے سوچا کہ ان کا مشن قدیم کو اجاگر کرنا نہیں ہے بلکہ جدید کو سامنے لا کر لوگوں کی اصلاح کرنا ہے۔ اب وہ حقیقت پسندی پر مائل تھے۔ انھوں نے غریب اور بے سہارا لوگوں کی مشکلوں کو سماج اور حکمرانوں کے روبرو رکھنے کا عزم کیا۔ ان کے اس دور کے ناولوں کو پڑھ کر اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ نجیب نے اپنی ذمہ داری بخوبی نبھائی ہے لیکن حکمرانوں تک ان کا پیغام شاید پوری طرح نہیں پہنچ پایا۔ ان کے اس دور کے شاہکار سماجی ناولوں میں ''القاہرہ الجدیدۃ''، ''خان الخلیلی'' اور ''زقاق المدق'' سرفہرست ہیں۔ جیسا کہ مضمون کے آغاز میں ذکر کیا گیا ہے کہ نجیب کو قدیم قاہرہ میں واقع اپنے محلّہ جمالیہ سے بہت لگاؤ تھا اور یہی وجہ ہے کہ ان کے زیادہ تر سماجی قصے کہانیاں انھی گلیوں کے اردگرد گھومتی ہیں۔ ان کے ناولوں اور کہانیوں کے مجموعوں کے نام بھی اسی علاقے کی گلیوں، محلوں کے نام سے موسوم ہیں۔ اس دور کے سماجی ناولوں میں ان کے ان تین ناولوں کو خاصی اہمیت حاصل ہے جن کو ثلاثیہ کے نام سے جانا جاتا ہے وہ ہیں: بین القصرین، قصر الشوق اور السکریہ۔ سماجی ناولوں کا دور 1945 سے 1960 تک رہا۔

1961 سے ان کی ادبی زندگی کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے جس کو چند لوگوں نے پوسٹ ریالسٹک (Post-realistic) کا نام دیا ہے اور کچھ لوگوں نے Allegoric یا Philosophic کے نام سے یاد کیا ہے۔

پچاس سال کی عمر کو پہنچتے پہنچتے نجیب کی سوچ میں پختگی آئی اور ان کی فکر اس فلسفہ میں الجھ کر رہ گئی جس کی تعلیم انھوں نے بی۔ اے۔ تک حاصل کی تھی لیکن جس کو پڑھنا اور سمجھنا انھوں نے آخر تک نہیں چھوڑا تھا۔ چند نقادوں کی رائے میں ان کی ادبی زندگی کا یہ تیسرا دور تھا۔ ان کی تحریر کے مزاج اور اسلوب کے پیش نظر یہ خیال ظاہر کیا جاتا ہے لیکن میرا خیال اس سے ذرا مختلف ہے۔ زندگی کے کسی بھی موڑ پر انسان خود کو اپنے ماضی سے الگ نہیں کر سکتا۔ انسان کا ماضی اس کا سایہ ہوتا ہے جو ہمیشہ اس کے ساتھ رہتا ہے۔ نجیب محفوظ نے اپنے آخری دم تک جو کچھ لکھا اس میں ایک استمراریت تھی۔ نہ ہی ان کا مزاج بدلا تھا اور نہ ہی ان کا اسلوب، البتہ سماجی اصلاح کے لیے ان کا ڈھنگ ضرور بدلا تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ ''پدرم سلطان بود'' کے دائرے سے نکل کر مصری انسان سوچنا سیکھے۔ دین کی حدوں کو سمجھ کر اپنی دنیا کو جو اسلام کا ایک اٹوٹ حصہ ہے، بنانے کی کوشش کرے۔ اس سلسلے کا سب سے پہلا ناول ''اولاد حارتنا''، یعنی میرے محلے کے بچے تھا۔ اس ناول میں انھوں نے فلسفیانہ اور رمزیہ انداز میں اللہ تعالیٰ اور انبیا اور پیغمبروں کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کیا ہے۔ ان کے اس ناول پر حکومت نے پابندی عائد کر دی۔ اس کے بعد بھی انھوں نے کچھ رمزیہ ناول لکھے جن میں اللص و الکلاب، (یعنی چور اور کتے)، ثرثرہ فوق النیل (یعنی نیل پر گپ شپ) اور 'السمان و الخریف' (یعنی تیتر اور موسم خزاں) شامل ہیں۔

یوں تو نجیب محفوظ کا ہر ناول اپنے آپ میں ایک شاہکار ہے لیکن چند نقادوں کی نظر میں نجیب محفوظ کا مرتبہ بلند کرنے میں ان کے رمزیہ ناول ''اللص و الکلاب'' کا بڑا دخل ہے۔ لوگوں کا کہنا ہے کہ ''اللص و الکلاب'' کے بعد نجیب کو ہر کس و ناکس جاننے لگا اور ان کو عالمگیر شہرت مل گئی۔

کہا جاتا ہے کہ نجیب محفوظ کو ان کے ناول ''اولاد حارتنا'' کی بنا پر نوبل انعام حاصل ہوا۔ لیکن میرا خیال ہے کہ ایسا نہیں ہے کیونکہ ''اولاد حارتنا'' ان کے رمزیہ ناولوں کی سب سے پہلی کڑی ہے جو پہلی بار 1960 کے آس پاس

عربی زبان میں چھپا تھا جب کہ نوبل انعام انھیں 1988 میں ملا۔ البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ ان کو نوبل انعام دیتے وقت ''اولاد حارتنا'' کو بھی پیش نظر رکھا گیا ہو کیونکہ اس ناول کے ذریعے نجیب نے جانے انجانے کسی حد تک مطرفی مطمح نظر کو پورا تو ضرور کیا ہے۔ پھر بھی ہمارا خیال ہے کہ ''اودلا حارتنا'' ان کی ادبی کاوشوں کا فنی نقطۂ عروج ہے جو انھی کے مطابق ایک کتاب کی طرح پڑھا گیا، ایک ناول کی طرح نہیں اور یہی وجہ ہے کہ اس کے بارے میں غلط فہمیاں پیدا ہوئی ہیں۔

نجیب محفوظ نے عربی زبان میں قصے، کہانیاں اور ناول لکھنے کی پہل تو نہیں کی کیونکہ ان سے قبل محمد حسین ہیکل، جُورجی زیدان وغیرہ اس فن کی بنیاد ڈال چکے تھے اور کہانیوں کا سہرا محمد تیمور اور محمود تیمور کے سر جاتا ہے۔ لیکن نجیب محفوظ کے ناولوں اور کہانیوں میں فنی پختگی ملتی ہے۔ نجیب محفوظ عربی ادیب تھے اور انھوں نے بنیادی طور پر عربوں کے لیے لکھا لیکن عالمی ادب میں انھوں نے بلند و بالا مقام حاصل کیا ہے۔ ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ کسی بھی فن میں بلندی پر پہنچنے والا شخص کسی ایک گروپ، قوم یا ملت کا نہیں ہوتا بلکہ اس کی شخصیت عالمگیر ہوتی ہے اور وہ پوری دنیا کا مشترکہ سرمایہ ہوتا ہے اور شاید اسی بات کو مدنظر رکھتے ہوئے سویڈش اکیڈمی نے مندرجۂ ذیل الفاظ میں نجیب کا تعارف کرایا:

''جنھوں نے اپنے پر معنی ادب پاروں کے ذریعے، اپنے حقیقت پسندانہ اسلوب کے ذریعے اور اپنے پراسرار انداز کے ذریعے عربی ادبی تحریروں کو نہایت بلندی پر پہنچا وہ تمام دنیا کا مشترکہ سرمایہ ہیں۔''

نجیب محفوظ کے طبعی میدان کو دیکھتے ہوئے نقادوں نے ان کی تحریروں کو تین ادوار میں ضرور تقسیم کر دیا ہے اور ایسا شاید انھوں نے نجیب محفوظ کو بہتر طور پر سمجھنے کی غرض سے کیا ہے۔ انھوں نے نجیب کی تحریروں کو (1) تاریخی (2) سماجی اور (3) رمزیہ یا فلسفیانہ خانوں میں رکھا ہے لیکن ہماری نظر میں نجیب کی کوئی بھی تحریر صرف ایک موضوع پر نہیں ہے۔ ان کی ہر تحریر میں بیک وقت سماجیات بھی ہے، اقتصادیات بھی، سیاسیات بھی ہے اور دینیات بھی۔

البتہ یہ بات ضرور ہے کہ ابتدائی تحریروں میں مصری تاریخ زیادہ حاوی رہی ہے تو دوسرے دور کی تحریروں میں سماجیات اور تیسرے دور کی تحریروں میں فلسفہ۔

نجیب محفوظ کہتے تھے کہ ان کی تحریریں، ان کا طرز فکر اور ان کا اسلوب ان تمام ادیبوں کے طرز فکر اور اسلوب کی دین ہیں جن کو انھوں نے بچپن سے پڑھا۔ ان میں موپاساں بھی شامل ہیں اور کافکا بھی۔ پروست اور چیخوف بھی، دوستوفسکی اور والٹر اسکاٹ بھی، سلامہ موسیٰ اور العقاد بھی، طٰہٰ حسین اور منفلوطی بھی، اناطول فرانس اور گورکی بھی۔

نجیب محفوظ نے اپنی زندگی کے ابتدائی دنوں میں شاعری بھی کی، یہ اور بات ہے کہ ان کی شاعری دن کی روشنی کبھی نہیں دیکھ سکی۔ خود ان کے اعتراف کے مطابق جب انھوں نے محسوس کیا کہ وہ موزوں شعر نہیں کہہ سکتے تو انھوں نے آزاد نظم میں طبع آزمائی کی۔ 1926 میں انھوں نے عربی زبان میں آزاد نظم کی بنیاد رکھی۔ لیکن وہ شاعری کے لیے نہیں بنے تھے۔ اس لیے یہ سلسلہ جلد ہی ختم ہو گیا کیونکہ اب ان کو اپنا راستہ مل گیا تھا۔

ایک اندازے کے مطابق نجیب محفوظ کے 35 ناول اور 14 قصے کہانیوں کے مجموعے شائع ہوئے ہیں۔

ان کو سب سے پہلا قومی ایوارڈ 1970 میں ملا۔ 1988 میں نوبل انعام ملا۔ قارئین کے لیے یہ بات جاننا شاید دلچسپی کا باعث ہو کہ نجیب نے کبھی اپنی زندگی میں مصر سے باہر قدم نہیں نکالا۔ نوبل انعام لینے کے لیے بھی انھوں نے اپنی دونوں بیٹیوں ام کلثوم اور فاطمہ کو بھیجا تھا۔ اس وقت تو وہ بہت کمزور بھی تھے اور ان کے پاس جواز بھی تھا۔

30 اگست بروز بدھ 2006 کو اس عہد ساز ادیب نے داعیِ اجل کو لبیک کہا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

□□□

رابطہ:
CAAS, SLL&CS
JNU, New Delhi-110067

بچوں کی صلاحیتیں ان کی مادری زبان سے ابھرتی ہیں۔
گھروں میں بہتر اردو تعلیم کا انتظام کیجیے۔
اردو کی نئی نسل کو تیار کرنا ہم سب کا فرضِ اولین ہے۔

شفیع مشہدی

عبدالمغنی: ایک ہمہ جہت شخصیت

عام طور سے شخصیتوں پر مضمون لکھتے وقت ہمہ جہت، ہمہ گیر اور کثیرالجہت جیسے الفاظ کا کثرت سے استعمال ہوتا ہے۔ توصیف وعقیدت کے اعتبار سے ممکن ہے یہ درست ہو مگر تمام شخصیتوں پر اس کا اطلاق اپنی معنویت کے حوالے سے مناسب نہیں ہوتا۔ مگر پروفیسر عبدالمغنی مرحوم کی شخصیت کے سلسلے میں ''کثیرالجہت شخصیت'' کہنا بالکل درست اور جائز ہے۔ موصوف بیک وقت عالم دین، مبلغ، قرآن کریم کے مترجم (انگریزی میں)، انگریزی کے پروفیسر، ٹی۔ایس۔ایلیٹ کے محقق، اقبال شناس، صاحب طرز ناقد اور اردو تحریک کے ممتاز قائد تھے۔ عربی، اردو، فارسی اور انگریزی زبان و ادب پر ان کی گہری نظر تھی اور اسلامی تاریخ، فلسفہ اور شریعت پر انھیں عبور حاصل تھا۔ چنانچہ ان کی تصنیفات میں بھی یہ تنوع موجود ہے۔ ان کے عزیز دوست اور معروف طنز و مزاح نگار رضا نقوی واہی مرحوم نے اپنے مضمون ''حضرت عبدالمغنی: میرے عزیز دوست'' میں ان کی ہمہ جہت شخصیت کے بارے میں لکھا ہے:

''ڈاکٹر عبدالمغنی کی ذات بابرکات ایک ایسی کثیرالمقاصد خودکار مشین ہے جس میں لاتعداد بٹن لگے ہوں۔ بٹن دباتے جایئے، ان کی مختلف النوع تصویریں نظر آتی جائیں گی۔ مدرسہ شمس الہدیٰ سے فارغ التحصیل، یونیورسٹی میں ریڈر اور انگریزی کے استاد، بہار انجمن ترقی اردو کے صدر، کوئی موضوع ہو قلم برداشتہ تحریر یا برجستہ تقریر کرنے میں ماہر، سیاسی پلیٹ فارم ہو یا محفل میلاد، رمضان المبارک میں محلے کی مسجد میں تراویح پڑھانی ہو یا نمازیوں کی امامت کرنی ہو، ادبی سیمینار میں حصہ لینا ہو یا مشاعرے کی صدارت کرنی ہو، ہر جگہ حاضر۔ اردو کا مسئلہ ہو یا مسلم پرسنل لا کی بات، وفد کے ساتھ وزیر اعلیٰ سے مل رہے ہیں، انگریزی اور اردو اخبارات میں دھڑا دھڑ بیان پر بیان چھپوا رہے ہیں۔ تنظیمی صلاحیت ایسی کہ انجمن ترقی اردو جو کبھی روایتی شاعری کے معشوق کی کمر کا درجہ رکھتی تھی، آج اردو کی وکالت کا ایسا زبردست ادارہ بن گئی ہے...... کنجوسی کی حد تک ایماندار ہیں لیکن پرہیزگار مولوی اور واعظ حق پرست ہیں۔'' (بودھ دھرتی۔ گیا۔ دسمبر 1989)

پروفیسر عبدالمغنی کی پیدائش 1937 میں اورنگ آباد کے ایک ذی علم خانوادے میں ہوئی تھی۔ آپ کے والدِ ماجد مولانا سید عبدالرؤف ندوی عالم دین تھے اور ان کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے پروفیسر عبدالمغنی نے تعلیم کی ابتدا مدرسہ شمس الہدیٰ (پٹنہ) سے کی۔ عالم ہو جانے کے بعد انھوں نے پٹنہ یونیورسٹی میں داخلہ لیا اور وہاں سے انگریزی میں ایم۔اے۔ کیا۔ انھوں نے "T.S. Eliot's Concept of Culture" کے موضوع پر پی ایچ۔ڈی۔ کی ڈگری حاصل کی اور 1996 تک پٹنہ یونیورسٹی میں پروفیسر رہے۔ وہ للت نرائن متھلا یونیورسٹی دربھنگہ کے وائس چانسلر بھی رہے۔ اس مجاہد اردو نے 5 ستمبر 2006 کو داعیِ اجل کو لبیک کہا۔

پروفیسر عبدالمغنی کے منفرد اسلوب اور مخصوص نظریۂ فکر نے ان کے ہم عصر نقادوں میں انھیں ایک الگ شناخت دی تھی۔ وہ اپنے نظریات میں متشدد تھے اور تمام تر اعتراضات کے باوجود ان کی ناقدانہ صلاحیت کا اعتراف تو دشمنوں نے بھی کیا ہے۔

سید احمد قادری نے 2005 میں ان کا انٹرویو لیا تھا جس کے اقتباسات پروفیسر عبدالمغنی کے تنقیدی نظریات کی وضاحت کرتے ہیں۔ اقتباس ملاحظہ کیجیے۔

''سوال: عصرِ حاضر کی اردو شاعری کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

عبدالمغنی: ''آزاد نظم، آزاد غزل اور نثری شاعری میں شعریت کا قتل عام کیا گیا ہے ... اچھی شاعری اسی وقت ممکن ہوگی جب آزاد نظم نگاری، آزاد غزل گوئی اور نثری شاعری کو دریا بُرد کر کے پابند نظم نگاری اور پابند غزل گوئی کی روایت کو فروغ دیا جائے۔''

کچھ جارحانہ سا انداز عبدالمغنی کے اسلوب تنقید کا خاصہ تھا اور ایسی ہی باتوں کے لیے ان پر تشدد ہونے اور انانیت کا الزام بھی لگایا جاتا تھا جس کے جواب میں موصوف کا کہنا تھا کہ وہ بہت سوچ سمجھ کر کوئی رائے قائم کرتے ہیں اس لیے اس میں تبدیلی کا سوال ہی نہیں ہوتا۔

اپنے تنقیدی نظریے کے بارے میں وہ خود رقمطراز ہیں۔

''حقیقت یہ ہے کہ میں تنقید میں نظریے کا قائل ہوں اور جب نظریے

کی جستجو کی جائے گی تو ظاہر ہے کہ کسی نظام فکر اور فلسفۂ حیات کا تجسس کیا جائے گا۔ ہمارے سامنے جو نظریات ہیں وہ عمومی اور بنیادی طور پر دو ہی قسم کے ہیں۔ ایک روحانی و اخلاقی اور دوسرے مادی و معاشی...... میں مادی و معاشی پر روحانی و اخلاقی کو ترجیح دیتا ہوں...... ادب پر نہ تو ریاست کی جبریت مفید ہے اور نہ خرد کی مریضانہ بوالہوسی کے حملے اور نہ فرقہ پرستانہ مذہبیت کی یورش......

میرا تصور تنقید یہ ہے کہ زندگی اور ادب دونوں کو اپنی اپنی جگہ ایک کل اور ایک دوسرے کے ساتھ مربوط سمجھ کر پارۂ فن کا تجزیہ وتبصرہ کرنا چاہیے۔''

موصوف نے اس اسلوب تنقید کو اخلاقی کہا ہے۔

ان کے تنقیدی نظریات سے آپ یا ہم متفق ہوں یا نہ ہوں، یہ اعتراف تو کر ہی سکتے ہیں کہ عبدالمغنی کا اپنا نظریۂ تنقید اور اسلوب تھا اور جس کے سلسلے میں انھوں نے اعتدال پسندی کی بات بھی کہی ہے مگر تنقید کرتے وقت یہ اعتدال پسندی ان کا ساتھ چھوڑ دیتی تھی اور اس میں جارحیت وقطعیت نمایاں ہو جاتی تھی۔

اردو زبان و ادب کے حوالے سے پروفیسر عبدالمغنی کی خدمات کا ساری اردو دنیا اعتراف کرتی ہے۔ اردو تحریک کے سلسلے میں ان کی گراں قدر خدمات کا اعتراف ان کے ناقدین کو بھی ہے۔

بہار کی سرزمین سے وابستہ دو ناقدین کلیم الدین احمد اور عبدالمغنی، اپنے نظریات، اسلوب اور رجحان کے اعتبار سے بالکل مختلف بلکہ ایک دوسرے کی ضد تھے۔ کلیم الدین احمد کا اردو تنقید میں جو مقام ہے اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ ان کے تبحر علمی اور جارحانہ انداز بیان سے بھی لوگ واقف ہیں۔ چنانچہ کلیم الدین احمد نے جب ''اقبال— ایک مطالعہ'' میں انتہائی بے دردی کے ساتھ اقبال کے فلسفے اور شاعری کا پوسٹ مارٹم کیا تو سارے لوگ چونک گئے اور بیشتر لوگ خفا بھی ہو گئے۔ کلیم الدین احمد نے لکھا تھا:

''حقیقت یہ ہے کہ اردو تنقید میں بت پرستی کچھ اس طرح رچ بس گئی ہے کہ اس نے دو بڑے دیوتا بنائے ہیں، غالب اور اقبال اور جہاں اس قسم کی ذہنیت نے جڑ پکڑ لی ہو، وہاں بے لاگ تنقید کا گزر نہیں ہو سکتا...... ان کی شاعرانہ بزرگی سے متعلق ایسے Wild Assertions کیے جاتے ہیں کہ عقل انگشت بدنداں ہے کہ اسے کیا کہیے۔''

کلیم الدین احمد کی اس بت شکنی پر غالب اور اقبال کے مداحوں کا تلملا اٹھنا فطری تھا۔ چنانچہ کلیم الدین احمد کے جواب میں عبدالمغنی نے ''اقبال اور عالمی ادب'' تحریر کی۔ ان دونوں کا مطالعہ بے حد دلچسپ اور فکر انگیز ہے۔ مختصر سے مضمون میں اس پر تفصیلی بحث ممکن نہیں مگر مسجد قرطبہ کے سلسلے میں کلیم الدین احمد کی تنقید کا اقتباس اور عبدالمغنی کا جواب پڑھنے کے قابل ہے۔

''مسجد قرطبہ کا موضوع جیسا کہ میں نے کہا ہے مسلمانوں کے لیے دل خوش کن ہے۔ یہ خیال کہ صرف مرد مومن، مرد حُر، مرد آزاد کے کام کو وہ فنون لطیفہ ہو یا زندگی کے کسی اور شعبے میں زندگی جاوید عطا ہوتی اور ہو سکتی ہے اور نقش نو کہ کہن، اگر وہ مرد مومن کی تخلیق نہیں تو وہ فانی ہے، یہ بات مسلمانوں کے لیے دل خوش کن اور ہمت افزا ہو تو ہو، لیکن واقعیت سے دور ہے اور جس نظم کا موضوع کھوکھلا یا غلط ہو وہ نظم کس کام کی۔'' (کلیم الدین احمد)

عبدالمغنی نے اس کا جواب یوں دیا ہے۔

''مسجد قرطبہ نہ صرف اقبال اور اردو کی بہترین نظم ہے بلکہ دنیا کی بہترین نظم ہے۔ اس کے لازوال فنی حسن اور فکری بصیرت کے سامنے شیلی اور کیٹس کے سارے اوڈس (Odes) اور دیگر نظمیں گرد ہیں۔ ملٹن کی Sailing Tobyzantium اور ایلیٹ کی Waste Land تو کسی شمار میں نہیں...... شیکسپیئر، دانتے اور گیٹے کی بھی کوئی نظم اگر مسجد قرطبہ کے ٹکر کی ہو تو جناب کلیم الدین احمد پیش فرمائیں...... اگر دنیا کی کسی نظم میں جسم انسانی کی طرح عضویاتی پیوستگی ہے تو اس کا بہترین نمونہ 'مسجد قرطبہ' ہی ہے جس کی کوئی مثال دنیائے شاعری میں نہیں۔ جیسا نظم کا موضوع ہے ویسی ہی نظم ہے۔

نہیں ہے تیر گردوں اگر، حسن میں تیری نظر
قلب مسلماں میں ہے اور نہیں ہے کہیں''

(عبدالمغنی)

دو ناقدین کے یہ متضاد نظریات انتہا پسندی کی طرف بھی اشارہ کرتے ہیں اور دعوت فکر بھی دیتے ہیں۔

نقطۂ نظر (مجموعۂ مضامین) 1965، جادۂ اعتدال (مجموعۂ مضامین) 1972، ہندوستان میں مسلم اقلیت کا مسئلہ (1972)، برنارڈ شا (1976)، تشکیل جدید (مجموعۂ مضامین) 1976، معیار و اقدار (مجموعۂ مضامین) (1981)، اقبال اور عالمی ادب (1982)، اقبال کا نظام فن (1985)، T.S. Eliot's Concept of Culture (English) (1986)، قرۃ العین حیدر کا فن (1991)، قرآن کا فلسفۂ تاریخ (1990)، اقبال کا ذہنی وفنی ارتقا (1991)، فروغ تنقید (1998)، غالب کا فن (1999)، تہذیبوں کا تقابلی مطالعہ (2001)، Translation of Quran (English) (زیر طبع) اور An Approach to World History پروفیسر عبدالمغنی کی چند اہم تصانیف ہیں۔

ان کے علاوہ اسلوب تنقید، تنقیدی زاویے، تصورات، تنقید شرف، میر کا تغزل اور دیگر اسلامی، تاریخی اور ادبی موضوعات پر دو درجن سے زائد کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ خاص طور سے قرآن کریم کا انگریزی میں ترجمہ جسے انھوں نے حال ہی میں مکمل کیا ہے۔ ان کے علمی کارناموں کو مزید بلندی عطا کرتا ہے۔

اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ عبدالمغنی نے اردو تنقید پر اپنی گہری چھاپ چھوڑی ہے۔ ان سے اختلاف تو کیا جا سکتا ہے مگر انھیں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ان کے ذکر کے بغیر اردو تنقید کی تاریخ نامکمل رہ جائے گی۔

موضوعات مضامین کے تنوع اور ان کی متنوع صلاحیتوں کے اعتبار سے ان کی شخصیت کو ہمہ جہت یا کثیر الجہت کہنے کا پورا جواز موجود ہے۔ علمی، اسلامی، ادبی، تاریخی اور دیگر موضوعات پر انھوں نے اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں مضامین قلمبند کیے ہیں۔ انھوں نے جو گراں قدر علمی و ادبی سرمایہ چھوڑا ہے وہ انھیں صدیوں تک زندہ رکھنے کے لیے کافی ہے۔ اردو زبان و ادب اور خاص کر اردو تحریک کی قیادت میں جو کارہائے نمایاں انھوں نے انجام دیے ہیں ان کے پیش نظر اردو دنیا ان کی کمی ہمیشہ محسوس کرے گی اور ان کی موت سے جو خلا پیدا ہوا ہے وہ شاید ہی پر ہو سکے۔

□□□

رابطہ:
F-1, Grand's Pallavi Court
Judges Court Road
Patna-800004

कौमी काउन्सिल बराए फरोग़-ए-उर्दू ज़बान

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

National Council for Promotion of Urdu Language
Ministry of Human Resource Development,
Depatment. of Secondary & Higher Education, Govt. of India

آٹھواں کل ہند اردو کتاب میلہ
(आठवाँ कुल हिन्द उर्दू किताब मेला)

تاریخ : 17 تا 24 دسمبر، 2006
مقام : محمد علی پارک سینٹرل ایوینیو، نزد زکریا اسٹریٹ، کولکاتا
اشتراک : مغربی بنگال اردو اکاڈمی، کولکاتا

کتابیں ماضی کا اثاثہ، حال کا سرمایہ اور مستقبل کی اساس ہیں
ملک بھر کے مشہور و ممتاز اردو ناشرین کی شرکت متوقع ہے

فارم جمع کرنے کی آخری تاریخ: 20 نومبر 2006

اسٹال کی بکنگ پہلے آئیے پہلے پائیے کی بنیاد پر ہوگی

رابطہ کے لیے رجوع فرمائیں: شعبۂ فروخت و نمائش کتب، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک ۔8، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی ۔110066
فون: 26109746, 26169416 فیکس ۔26108159 ای میل: urducoun@ndf.vsnl.net.in

رضا نقوی واہی

حضرت عبدالمغنی: میرے عزیز دوست

پرانے زمانے میں بگڑا شاعر اپنی عاقبت سنوارنے کے لیے مرثیہ گو بن جاتا تھا۔ آج کے دور میں بعض بگڑے شاعر دوسروں کی عاقبت بگاڑنے کے لیے نقاد بن جاتے ہیں۔ ہوتا یہ ہے کہ ابتدا میں شاعری کی گئی، کلام کے ایک یا دو مجموعے بھی چونکا دینے والے ناموں کے ساتھ چھپوائے گئے (مثلاً 25 نظمیں، 42 نظمیں گنج سوختہ وغیرہ) لیکن جب ''کس نمی پرسد کہ بھیا کون ہو'' کی منزل ہی میں رہے، کسی نے درخورِ اعتنا نہ سمجھا، تو انتقاماً اشہبِ قلم کی باگ تنقید نگاری کی جانب موڑ دی گئی اور حشر یہ ہوا کہ:

آپ کو اہلِ قلم سے اک کدورت ہو گئی
نظم ہو یا نثر دونوں ہی سے نفرت ہو گئی
آپ کا قبضہ ہوا تنقید کے میدان پر
اک مصیبت آ گئی شعر و ادب کی جان پر
خامۂ خونخوار نے اک حشر برپا کر دیا
جو بھی زد میں آ گیا اس کا صفایا کر دیا

شاعری کا میدان چھوڑ کر بھاگے ہوئے ایسے نقاد جب بقول پروفیسر سید محمد محسن، نرگسیت کے شکار ہوتے ہیں تو کریلا چڑھا نیم کی مثل صادق آتی ہے اور ان کی تنقید نگاری جارحانہ انداز اختیار کر لیتی ہے۔

ڈاکٹر عبدالمغنی بھی شاعری کی پگڈنڈی پر چل کر تنقید کے اکھاڑے میں اترے، لیکن ان کی فطرت میں نرگسیت کا خمیر نہیں ہے، اس لیے شعر و ادب کی جان کے لیے مصیبت نہیں بنے۔ آدمی ہوشیار ہیں، اپنی چودھراہٹ قائم کرنے کے لیے شاعروں اور ادیبوں کی ٹوپیاں نہیں اچھالیں اور نہ بیچاروں کی عاقبت بگاڑنے کے لیے اپنے قلم کو خونخوار بنایا۔

عبدالمغنی صاحب کی شعر گوئی کا سراغ مجھے بڑے ڈرامائی انداز میں ملا تھا۔ کوئی بیس برس ادھر کی بات ہے۔ ہم دونوں ایک ادبی تقریب میں شرکت کی غرض سے رانچی گئے تھے۔

واپسی میں ٹرین کے کمپارٹمنٹ میں ہم دونوں کے علاوہ کوئی اور ہم سفر نہیں تھا۔ جب گاڑی کھلی تو مغنی صاحب نے فرمایا کہ آیئے، اپنے کچھ اشعار سناتا ہوں پھر جیب سے نوٹ بک نکالی اور بڑی خوش الحانی سے غزلیں سنانے لگے۔ اشعار صاف ستھرے اور بڑے جاندار تھے۔ مجھے ان کی طبیعت کا یہ رخ معلوم نہیں تھا اس لیے حیرت اور مسرت کی ملی جلی کیفیت میں ڈوب کر کلام سنتا رہا۔ جب جی بھر سنا چکے، تو مجھ سے ملتجیانہ انداز میں کہنے لگے کہ میں ان کی شاعری کا تذکرہ کسی اور سے نہ کروں۔ مجھے ان کی اس ادا پر بھی سخت حیرت ہوئی کیونکہ عموماً جب شاعر ایک یا دو غزل لکھ لیتا ہے تو اس پر اشعار سنانے کا دورہ پڑتا ہے، پھر ان اشعار کی تشہیر کے لیے اخبارات و رسائل کے دفاتر کی خاک چھاننے لگتا ہے۔ اگر غلطی سے کسی نے ایک شعر سنانے کی فرمائش کی، تو وہ پوری پوتھی سنانے پر تل جاتا ہے۔ لیکن عبدالمغنی صاحب ایسے حضرات سے مختلف نکلے۔

بہرحال اس دوران، انھوں نے نقادوں کی صف میں اپنا ایک اہم مقام بنا لیا۔ سیکڑوں تنقیدی مضامین لکھے، تابڑ توڑ کئی مجموعے بھی منظر عام پر آئے، بعض مجموعے کی قیمت اتنی زیادہ رکھی گئی کہ سوائے اسمگلروں یا ان حضرات کے جن کی آمدنی دستِ غیب یا پٹرو ڈالر کی مرہونِ منت ہوتی ہے، کوئی دوسرا خرید کر پڑھ نہیں سکتا۔ لہٰذا میں خدا کو حاضر و ناظر جان کر اقرار کرتا ہوں کہ میں نے ان کے چند ہی مضامین اور وہ بھی گاہے گاہے ادبی رسائل میں پڑھے ہیں۔ اس لیے مجھے ان کی تنقید نگاری کے باب میں کچھ عرض کرنا یا اس سے کچھ لینا دینا نہیں ہے، بلکہ مجھے موصوف کے تنقیدی مضامین سے زیادہ ان کی کھلی، کھری اور صاف و شفاف شخصیت پسند ہے اور اس شخصیت کی چند جھلکیاں اس مضمون میں پیش کرنا چاہوں گا۔

قارئین کی واقفیت کے لیے یہ عرض کرتا چلوں کہ ڈاکٹر عبدالمغنی، ریڈر شعبۂ انگریزی پٹنہ یونیورسٹی، عمر کے لحاظ سے میرے بڑے صاحب زادے سے دو تین سال بڑے ہیں، لیکن میں ان کو اپنے ان بے تکلف عزیز دوستوں کی صف میں شمار کرتا ہوں جو مجھ سے دو چار برس بڑے یا ہم عمر ہیں۔ عمر کے

رضا نقوی واہی مرحوم نے یہ خاکہ پروفیسر عبدالمغنی کی زندگی میں لکھا تھا۔ یہ خاکہ سید احمد قادری کی مرتب کردہ کتاب ''پروفیسر عبدالمغنی—حیات اور خدمات'' میں شامل ہے۔

اس تفاوت کے باوجود ذہنی ہم آہنگی نے ہم دونوں کو ایک دوسرے سے قریب کر رکھا ہے۔ میں اپنی ایک کمزوری بیان کروں، طبیعت کا ضدی واقع ہوا ہوں، اگر کسی کام کا بیڑا اٹھاتا ہوں تو ہزاروں رکاوٹوں اور مخالفتوں کے باوجود اسے پایۂ تکمیل تک پہنچانے کی کوشش کرتا ہوں۔ یہی مزاج عبدالمغنی صاحب کا بھی ہے اور مزاج کی اسی Tenacity کی وجہ سے میں انھیں ایک جنگلی چوپائے سے تشبیہ دیتا ہوں، جو دائیں بائیں دیکھے بغیر اپنے شکار کی جانب سیدھی دوڑ لگاتا ہے اور ایک ہی حملے میں اس کا وارا نیارا کر ڈالتا ہے۔ ترکی بہ ترکی جواب یا من ترا حاجی بگویم، کے انداز میں مغنی صاحب بھی مجھے اسی سیدھی دوڑ لگانے والے جاندار سے تشبیہ دیا کرتے ہیں۔ مزاجی ہم آہنگی کا ایک واقعہ بطور مثال بیان کرتا ہوں۔

1965 میں چند دوستوں نے جن میں عبدالمغنی صاحب پیش پیش تھے۔ طے کیا کہ ڈاکٹر اختر اورینوی کی ادبی خدمات کے اعتراف کے طور پر ایک رسالے کا 'اختر نمبر' نکالا جائے۔ ابتدا میں اختر صاحب نے اس پروگرام کی مخالفت کی، لیکن ہماری ضد کے آگے انھیں جھکنا پڑا۔ پٹنہ میں ایک صاحب ''ساغر'' نام کا ایک ماہنامہ نکالتے تھے۔ انھیں راضی کیا گیا کہ اختر نمبر اسی رسالے کے نام پر نکلے۔ مضامین حاصل کیے جانے لگے، کتابت شروع کرا دی گئی، فنڈ کی فراہمی کے لیے تگ ودو کی جانے لگی۔ اتنے میں چند مفاد پرست حضرات نے اس پروگرام کی شدت سے مخالفت شروع کردی۔ اختر صاحب (مرحوم) پر دباؤ ڈالا جانے لگا کہ وہ اپنی منظوری واپس لے لیں۔ ایک ماہنامہ اور ایک ہفت روزہ میں اعلانات شائع کیے جانے لگے کہ ''ساغر'' کا ''اختر اورینوی نمبر'' ایک ہوائی منصوبہ ہے جو ٹائیں ٹائیں فش ہو جائے گا، لہٰذا مضمون نگار حضرات، مضامین نہ بھیجیں۔ شہر کے ادبی حلقوں میں مخالفت کا بھونچال سا آگیا۔ ایسا معلوم ہونے لگا کہ اختر (مرحوم) کی ادبی خدمات کا اعتراف کرنا، ایک ایسا مجرمانہ عمل ہے جسے کسی قیمت پر یہ حضرات گوارا نہیں کرسکتے۔ کوشش کی گئی کہ کاتبوں کے یہاں چھاپہ مار کر جو مواد برائے کتابت دیا گیا تھا، اسے ہتھیا لیا جائے۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ ''ساغر'' کے ایڈیٹر نے بھی صاف کہہ دیا کہ اختر نمبر ان کے ادارے سے نہیں نکلے گا۔ ایسے وقت میں خود اختر صاحب بھی اس پروپیگنڈے سے خائف ہو گئے، ہمارے ساتھ مل کر کام کرنے والے چند نوجوان ساتھی بھی ڈھیلے پڑ گئے۔ ہمارے لیے یہ بڑی آزمائش کا وقت تھا۔ اختر صاحب نے مجھ سے کہا کہ نمبر نکالنے کا ارادہ ملتوی کر دو، میں نے جواب دیا کہ یہ ناممکن ہے، خواہ کتنی ہی مخالفت کیوں نہ ہو۔ عبدالمغنی صاحب کا بھی یہی اٹل فیصلہ تھا۔ اب سوال یہ پیدا ہوا کہ کس نام سے نمبر نکلے۔ مغنی صاحب کے پاس ریڈی میڈ جواب موجود تھا۔ مسکراتے ہوئے کہنے لگے کہ ''ساغرِ نو'' کے نام سے (جس کا کوئی وجود نہیں تھا) نمبر نکالا جائے گا۔ چنانچہ یہی ہوا۔ چھ سو صفحات پر مشتمل 'ساغرِ نو' کا اختر اورینوی نمبر آب وتاب سے نکلا۔ ایسے آڑے وقت میں مغنی صاحب نے میرا ساتھ دے کر عزتِ سادات بچالی۔ آج ساغر کا نام تک کوئی نہیں جانتا، جب کہ ''اقلیدس کا فرضی نقطہ'' سمجھا جانے والا ''ساغرِ نو'' ادبی دنیا میں آج بھی اختر اورینوی کے فکر وفن اور ان کی شخصیت کی شناخت کے لیے، ایک معتبر دستاویز ہے۔

اس مذکورہ واقعے کے علاوہ اور بھی کئی مواقع ایسے آئے جب میرے بعض منصوبوں کو عملی جامہ پہنانے میں مغنی صاحب نے انتہائی خلوص سے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ طوالت کے خیال سے ان تمام واقعات کو بیان کرنا نہیں چاہتا۔

ڈاکٹر عبدالمغنی کی ذاتِ بابرکات ایک ایسی کثیر المقاصد خودکار مشین ہے، جس میں لاتعداد بٹن لگے ہوں۔ بٹن دباتے جایئے، ان کی مختلف النوع تصویریں نظر آتی جائیں گی۔ مدرسہ شمس الہدیٰ کے فارغ التحصیل، یونیورسٹی میں ریڈر اور انگریزی کے استاد، بہار انجمن ترقی اردو کے صدر، کوئی موضوع ہو، قلم برداشتہ تحریر یا برجستہ تقریر کرنے میں ماہر، سیاسی پلیٹ فارم ہو یا محفل میلاد، رمضان المبارک میں محلے کی مسجد میں تراویح پڑھانی ہو، یا نمازیوں کی امامت کرنی ہو، ادبی سیمینار میں حصہ لینا ہو یا مشاعروں کی صدارت کرنی ہو ہر جگہ حاضر۔ اردو کا مسئلہ ہو یا مسلم پرسنل لا کی بات، وفد کے ساتھ وزیر اعلیٰ سے مل رہے ہیں، انگریزی اور اردو اخبارات میں دھڑا دھڑ بیان پر بیان چھپوا رہے ہیں۔ تنظیمی صلاحیت ایسی کہ انجمن ترقی اردو جو بھی روایتی شاعری کے معشوق کی کمر کا درجہ رکھتی تھی، آج اردو کی وکالت کا ایسا زبردست ادارہ بن گئی ہے، جس کی کوششوں سے اردو کو ریاست بہار میں دوسری سرکاری زبان کا درجہ مل کر رہا۔ کنجوسی کی حد تک ایماندار ہیں، انجمن کے صدر ہونے کی حیثیت سے چاہتے تو اپنے گھر پر ٹیلی فون لگوا لیتے، لیکن ٹیلی فون صدر دفتر میں لگوایا۔ ایک سیکنڈ ہینڈ موٹر خرید لیتے تو پٹنہ جیسے حریفِ زلفِ دراز شہر میں، انجمن کے کام یا ضرورت مندوں کی سفارش پیروی کرنے کے لیے گھر سے باہر نکلنے میں دشواری نہیں ہوتی، گھنٹوں رکشے یا ٹیمپو کے لیے سڑک پر کھڑے انتظار ساغر کھینچنے کی زحمت سے بچ جاتے، نیز پٹرول پر جتنی رقم خرچ ہوتی، اس سے بہت زیادہ رقم دوسری سواریوں پر اپنی جیب سے خرچ کرنی نہ پڑتی۔ لیکن پرہیزگار مولوی اور واعظ حق پرست ہیں، انجمن کے پیسے اپنی ذات پر خرچ کرنے سے گریز کرتے ہیں۔ ڈاکٹر اختر اورینوی مرحوم کے بعد ایسی چوکھی

اور فعال شخصیت، ریاستِ بہار میں فی الحال کوئی دوسری نہیں ہے۔ یہی سبب ہے کہ وہ معشوقِ ہزار دوست ہوتے ہوئے بھی، مجھے بہت عزیز ہیں۔

بہر حال، مندرجہ بالا بے پناہ مصروفیات انھیں صرف شہر عظیم آباد تک ہی محدود نہیں رکھتیں بلکہ ریاست بہار کے مختلف مقامات کے علاوہ ملک کے طول وعرض میں بھی دور دور تک لے جاتی رہتی ہیں، جس کے نتیجے میں کبھی کبھی ہفتوں بلکہ مہینوں وطنِ عزیز سے غائب رہتے ہیں۔

عرصہ ہوا، ایک بار جب وہ بہت دنوں تک پٹنہ سے باہر رہے تو میں نے تفریحاً ایک نظم لکھ کر ایک ہفت روزہ میں چھپوا دی۔ موضوع یہ تھا کہ "ایک اخبار میں دو خبریں شاہ سرخیوں کے ساتھ شائع ہوئیں۔ پہلی خبر یہ تھی کہ ڈاکٹر عبدالمغنی کسی جلسے کی صدارت کرنے کے لیے مظفر پور گئے ہیں۔ دوسری خبر یہ تھی کہ شہر مظفر پور میں دفعتاً مرغوں اور انڈوں کی قیمت آسمان سے باتیں کرنے لگی ہے۔ دو تین دنوں کے بعد اسی اخبار میں پھر دو خبریں شائع ہوئیں۔ ایک خبر کی شاہ سرخی تھی کہ ڈاکٹر عبدالمغنی مظفر پور سے واپس گئے، دوسری خبر تھی کہ شہر میں مرغوں اور انڈوں کی قیمت گھٹ کر اعتدال پر آ گئی۔"

عبدالمغنی صاحب نے میری نظم پڑھنے کے بعد اخبار کے اس شمارے کو اپنے سفری بیگ میں محفوظ کر لیا۔ اس کے بعد جب بھی پٹنہ سے باہر گئے تو جہاں بھی ٹھہرے وہاں سب سے پہلے اخبار کا وہ شمارہ میزبان کو پڑھنے کے لیے دیا۔ سمجھدار میزبان نے اشارہ پا کر، ہر کھانے میں اپنے مہمانِ خصوصی کو مرغ مسلّم کھلایا۔ یہ سلسلہ اتنا دراز ہوا کہ اب صاحبِ موصوف کو وہ اخبار ساتھ رکھنے کی ضرورت باقی نہیں رہی کیونکہ ملک بھر میں پھیلے ہوئے میزبان حضرات جنابِ عبدالمغنی اور مرغ کو لازم وملزوم سمجھنے لگے ہیں۔ اس موضوع پر میں نے منظوم خطوط انھیں لکھے تھے۔ ایک آزاد، دوسرا پابند۔ دونوں کے اقتباسات قارئین کی دلچسپی کے لیے پیش کر رہا ہوں۔

(1)

آپ بھی خوب ہیں اے حضرتِ مغنی واللہ
کیوں نظر آپ کی بدلی ناگاہ
ایک عرصے سے ہوئی ہے نہ ملاقات نہ بات
خشک ہے پیڑ روابط کا، کوئی ڈال نہ پات
نہ رہ و رسم کی گھنگھور گھٹا ہے نہ ملن کی برسات
یہ چلن آپ کا پہلے تو نہ تھا
گھر کے بھیدی کا یہ کہنا ہے کہ مرغوں کی کشش
کرتی ہے آپ کو آمادۂ کوچہ گردی
خواہ وہ موسمِ سرما ہو کہ فصلِ سردی
مجلسِ وعظ میں شرکت کا بہانہ کر کے
آپ رانچی کبھی جاتے ہیں کبھی بھاگلپور
وعظ و تقریر تو پردہ ہے، حقیقت یہ ہے
رکھ دیا مرغِ مسلم نے دِوانہ کر کے
بہر تقریر تو اختر بھی بہت جاتے ہیں
مجلسِ شعر میں ناچیز بھی ہوتا ہے شریک
منتظم، دے کے فقط داد ہی ٹرخاتے ہیں
شاذ ہی مرغِ مسلم ہمیں ہوتا ہے نصیب
میزباں آپ کے لیکن ہیں عجیب
جن کے تھیلے پہ فقط مرغ رہا کرتے ہیں
پالنے والے سے اب ہم یہ دعا کرتے ہیں
کہ خدایا ہمیں مغنی سی عطا ہو قسمت
محفلِ شعر و تقاریر میں جب بھی ہو ہماری شرکت
حضرتِ اختر و ناچیز کو ہر کھانے میں
مرغ و ماہی سے نوازا کرنا
مثلِ مغنی شکم و روح کو تازہ کرنا
ایک بات اور کروں گوش گزار
آیئے جب بھی سفر سے واپس
یافت جو کچھ بھی ہو اس میں ہمیں حصہ دیجیے
کم سے کم ایک جواں مرغ کی قیمت ہی سہی
ورنہ ہم، یعنی کہ ناچیز و جنابِ اختر
یہی مشہور کریں گے گھر گھر
وعظ و تقریر سے کچھ کام رہا کب ان کو
نہ ادب سے نہ سیاست سے ہے مطلب ان کو
کیوں بھلا جائیں کہیں قوم کا وہ غم کھانے
وہ تو جاتے ہیں فقط مرغِ مسلم کھانے

(16/جون 1970)

(2)

مانا کہ قرار آپ کے معدے کو نہیں ہے
مانا کہ کشش مرغ مسلم میں سوا ہے
اور اس کے بلاوے پہ ہیں سرگرم سفر آپ
قدموں تلے ناتا، تو کبھی ارض گیا ہے
ہر مولوی صاحب کا یہ حق شکمی ہے
واللہ مجھے اس کی شکایت نہ گلہ ہے
البتہ یہ کہنے کی تو چاہوں گا اجازت
معدے کے اُپر بَرتھ پہ اک دل بھی پڑا ہے
کیا آپ کو اس دل نے کبھی یہ نہیں ٹوکا
دو حرف کا اک کارڈ رقم کرنے میں کیا ہے
میزانِ تعلق پہ مجھے مرغ سے تولا
واللہ نیاباب کرم آپ نے کھولا

(25/اکتوبر1983)

آخر میں قارئین کرام سے عرض ہے کہ ڈاکٹر عبدالمغنی کی مرغ پسندی کا تذکرہ محض زیب داستاں کے لیے ہے، اسے حرف بہ حرف حقیقت پر مبنی نہ سمجھا جائے۔ وہ ایک نارمل مولوی صفت انسان ہیں، جو دسترخوان پر چنے جانے والے مختلف الاقسام ماکولات وفواکہات سے اتنی ہی رغبت اور دلچسپی رکھتے ہیں جتنی قاب میں پڑے مرغ بریاں سے، کیونکہ خدا کی جملہ نعمتوں سے (بشرطیکہ خوش ذائقہ اور اشتہا آور ہوں) کسی حال میں بھی انکار کر کے وہ گنہگار بننا نہیں چاہتے۔

اس مختصر سے خاکے میں ڈاکٹر عبدالمغنی کی ڈائنامک شخصیت کا تفصیلی جائزہ پیش کرنا ممکن نہیں تھا۔ لہٰذا ان چند سطور کو ان کی معروف اور رنگا رنگ زندگی کی فلم کا ٹریلر سمجھا جائے اور اسی پس منظر میں

قیاس کن زگلستانِ من بہار مرا

□□□

ہری بھری دنیا کے لیے

مصنف: ایما سکینہ/مترجم: طلعت گل

ایک دلچسپ سائنس فکشن جس میں دوسری دنیا کی مخلوقات کے ساتھ مل کر ہماری دنیا کے بچے ایک مہم پر روانہ ہوتے ہیں اور اس میں کامیابی حاصل کرتے ہیں۔

صفحات: 118، قیمت: -/28 روپے

شہر میں ایک جنگل

مصنف: کمارن ست سیلوم/مترجم: عباس آصف

چینئی (مدراس) غالباً دنیا کا واحد شہر ہے جس کی حدود کے اندر حقیقی معنوں میں جنگل کا وجود ملتا ہے۔ اس کتاب میں آئی آئی ٹی چینئی کے جنگل میں مصنف اور اس کے دوستوں نے جو تجربے کیے، انھیں افسانوی انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ کتاب سے جنگل کے چرند پرند اور دیگر حشرات الارض کے ساتھ ساتھ مختلف قدرتی اشیا سے متعلق بھی واقفیت حاصل ہوتی ہے۔

صفحات: 75، قیمت: -/19 روپے

کسے ما

مصنف: تھیو ماسکنڈ/مترجم: اقبال مہدی

سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی ہماری دنیا کو نت نئی تبدیلیوں سے ہمکنار کر رہی ہے۔ بیل گاڑی سے ترقی کر کے آج انسان مریخ پر کمندیں ڈال رہا ہے۔ اس کتاب میں ان ترقیات کے پیش نظر اب سے ایک ہزار سال بعد کی دنیا کا خاکہ پیش کیا گیا ہے۔

صفحات: 102، قیمت -/23 روپے

مکمل موصلیت

مصنف: دلیپ ایم سالوی/مترجم: گوہر رضا

مکمل موصلیت (سپر کنڈکٹیوٹی) دور جدید کی ایک اہم ایجاد ہے جس سے برقی توانائی کے میدان میں انقلابی تبدیلیاں رونما ہوں گی۔ اس کتاب میں مکمل موصلیت سے متعلق تمام تفصیلات پیش کرنے کے ساتھ ساتھ اس کی ایجاد کی کہانی بھی بیان کی گئی ہے۔

صفحات: 24، قیمت: 10 روپے

نوٹ: طلبہ کے لیے 45% اور اساتذہ کے لیے 40% کی خصوصی رعایت۔ تاجران کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر. کے. پورم، نئی دہلی-066 110

تحریر: امرتا پریتم
ترجمہ: خورشید عالم

شاہ کی رکھیل

اسے اب نیلم کے نام سے کوئی نہیں پکارتا تھا، سبھی اسے شاہ کی رکھیل کہتے تھے۔

لاہور کی ہیرا منڈی کے ایک چوبارے میں نیلم کی جوانی چڑھی تھی اور وہیں پر ایک ریاستی سردار کے ہاتھوں پورے پانچ ہزار میں اس کی نتھ اتری تھی اور وہیں اس کی خوبصورتی نے آگ بھڑکا کر شہر کو بھون دیا تھا۔ پھر ایک دن وہ ہیرامنڈی کا سستا چوبارہ چھوڑ کر شہر کے سب سے مہنگے ہوٹل فلیٹی میں آگئی تھی۔ وہی شہر تھا لیکن سارے شہر کو راتوں رات جیسے اس کا نام بھول گیا ہو۔ سبھی کے منہ سے سنتے تھے— ''شاہ کی رکھیل''۔

کمال کا گاتی تھی۔ کوئی گانے والا اس کی طرح مرزے (پنجاب کی ایک لوک دھن) کی صدا نہیں لگا سکتا تھا۔ اس لیے بھلے ہی لوگ اس کا نام بھول گئے تھے لیکن اس کی آواز نہیں بھولے تھے۔ شہر میں جس گھر میں بھی توے والا باجا (ریکارڈ پلیر) تھا، وہ اس کی آواز سے بھرے توے (ریکارڈ) ضرور خریدتا تھا۔ ہر گھر میں توے کی فرمائش کے وقت ہر شخص یہ کہتا تھا'' شاہ کی رکھیل کو آج ضرور سننا ہے''۔

یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں تھی، شاہ کے گھر والوں کو بھی معلوم تھا۔ صرف معلوم ہی نہیں تھا، ان کے لیے اب یہ بات پرانی ہو گئی تھی۔ شاہ کا بڑا بیٹا جو اب شادی کے قابل ہو گیا تھا، جب گود میں ہوتا تھا تب شاہنی نے زہر کھا کر مرنے کی دھمکی دی تھی لیکن شاہ نے اس کے گلے میں موتیوں کا ہار پہنا کر اس سے کہا تھا: شاہنی، وہ تیرے گھر کی برکت ہے۔ میری آنکھ جوہری کی آنکھ ہے۔ تم نے سنا نہیں کہ نیلم ایسی چیز ہوتی ہے جو لاکھ سے خاک اور خاک سے لاکھ کر دیتی ہے۔ جسے الٹا پڑ گیا اس کو لاکھ سے خاک کر دیتی ہے اور جسے موافق آجائے اسے خاک سے لاکھ کر دیتی ہے۔ وہ بھی نیلم ہے، ہماری آنکھ اس سے مل گئی ہے۔ جب سے ساتھ ہوا ہے میں مٹی میں ہاتھ ڈالوں تو سونا ہو جاتا ہے''۔

'' لیکن وہی ایک دن بربادی کی وجہ بھی بنے گی۔ لاکھ سے خاک کردے گی''۔ شاہنی نے چھاتی کی جلن کو برداشت کر کے اسی طرز میں دلیل دی تھی جس ڈھنگ سے شاہ نے بات چلائی تھی۔'' میں تو بلکہ ڈرتا ہوں کہ ان رکھیلوں کا کیا بھروسا، کل کو کسی اور نے سبز باغ دکھائے اور یہ ہاتھ سے نکل گئی تو لاکھ سے خاک ہو جائے گا''۔ شاہ نے پھر اپنی دلیل پیش کی۔

شاہنی کے پاس اب مزید کوئی دلیل نہیں تھی، صرف وقت کے پاس دلیل باقی تھی اور وقت خاموش تھا۔ کئی برسوں سے خاموش تھا۔ شاہ واقعی جتنے پیسے نیلم پر اڑاتا تھا اس سے کئی گنا زیادہ نہ معلوم کہاں کہاں سے اڑ کر اس کے گھر آجاتے تھے۔ پہلے اس کی چھوٹی سی دکان شہر کے چھوٹے سے بازار میں تھی، لیکن اب شہر کے سب سے بڑے بازار میں لوہے کے جنگلوں والی سب سے بڑی دکان اسی کی تھی۔ گھر کی جگہ پر پورا محلہ ہی اس کا تھا جس کے اندر کھاتے پیتے عزت دار کرائے دار تھے اور جس میں تہہ خانے والے گھر کو شاہنی نے ایک دن بھی نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دیا تھا۔

کئی سال قبل شاہنی نے مہروں والی صندوق کو تالا لگاتے ہوئے شاہ سے کہا تھا: '' اسے چاہے ہوٹل میں رکھو یا اس کے لیے تاج محل بنوادو لیکن باہر کی بلا کو باہر ہی رکھنا، اسے کبھی میرے گھر میں مت لانا۔ میں اس کی شکل بھی دیکھنا نہیں چاہتی''۔ اور واقعی آج تک شاہنی نے اس کا منہ نہیں دیکھا تھا۔ جب اس نے یہ بات کہی تھی، اس کا بڑا بیٹا ابھی اسکول جاتا تھا اور اب وہ شادی کے قابل ہو گیا تھا۔ لیکن شاہنی نے نہ تو اس کے گانوں والے توے (ریکارڈ) گھر میں آنے دیے اور نہ ہی گھر میں کسی کو اس کا نام ہی لینے دیا تھا۔ یوں اس کے بیٹوں نے ہر دکان پر اس کے گانے سن رکھے تھے اور ہر ایرے غیرے سے سنا ہوا تھا'' ''شاہ کی رکھیل''۔

بڑے بیٹے کی شادی تھی۔ گھر میں چار مہینے سے درزی بیٹھے ہوئے تھے۔ کوئی سوٹوں پر گوٹا لگا رہا تھا، کوئی تلا، کوئی دوپٹوں کو سنوار رہا تھا۔ شاہنی کے ہاتھ بھرے ہوئے تھے۔ روپیوں کی تھیلی نکالتی، کھولتی اور پھر دوسری تھیلی بھرنے کے لیے تہہ خانے میں پہنچ جاتی ہے۔

شاہ کے یاروں نے شاہ کو یاری کا واسطہ دیا کہ بیٹے کی شادی میں ''رکھیل'' ضرور آئے گی۔ یوں تو انھوں نے یہ بات بڑے سلیقے سے کہی تھی جس سے کہ شاہ کو غصہ نہ آجائے۔'' شاہ جی، ویسے تو ہزاروں ناچنے گانے والیاں ہیں لیکن ملکۂ ترنم ضرور آئے۔ بھلے ہی لرزے کی ایک تان چھیڑ کر لوٹ جائے۔

فلیٹی ہوٹل عام ہوٹلوں جیسا نہیں تھا۔ وہاں پر بیشتر انگریز مہمان ہی آ کر

ٹھہرتے تھے۔اس میں الگ الگ کمرے بھی تھے اور بڑے تین کمروں والے سیٹ میں نیلم رہتی تھی۔شاہ نے سوچا کہ دوستوں،یاروں کا دل رکھنے کے لیے وہ ایک دن نیلم کی ایک محفل رکھ لے گا۔

''یہ تو کوٹھے پر جانے جیسا ہوا، ایک نے اعتراض کیا تو سبھی ایک ساتھ بول پڑے''نہیں شاہ جی، یہ تو صرف آپ کا ہی حق بنتا ہے۔اس سے پہلے ہم نے کبھی کچھ کہا ہے؟اس جگہ کا نام بھی کبھی نہیں لیا۔وہ جگہ تو آپ کی امانت ہے۔ہمیں تو بھتیجے کی شادی کا جشن منانا ہے۔اسے خاندانی گھروں کی طرح اپنے گھر بلاؤ۔ہماری بھابھی کے گھر۔

بات شاہ کے دل کو بھا گئی۔اس لیے بھی کہ وہ دوستوں یاروں کو نیلم کا ٹھکانہ نہیں دکھانا چاہتا تھا۔بھلے ہی اس کے کان میں اس بات کی بھنک پڑتی رہتی تھی کہ اس کی غیر حاضری میں اب کوئی امیر زادہ نیلم کے پاس آنے لگا تھا۔اور دوسرا اس لیے بھی کہ نیلم ایک بار اس کے گھر آکر،گھر کی چمک دمک دیکھ جائے۔لیکن وہ شاہنی سے ڈرتا تھا۔دوستوں کو حامی نہ بھر سکا۔

دوست یاروں میں سے ہی کسی نے راستا نکالا اور شاہنی کے پاس جا کر اس سے کہا:بھابھی تمھارے بیٹے کے بیاہ پر گانا بجانا نہیں ہوگا؟ہمیں تو ہر خوشی منانا ہے۔شاہ کا مشورہ ہے کہ ایک رات یاروں کی محفل نیلم کے ہاں جائے۔بات تو ٹھیک ہے،لیکن ہزاروں روپے پھنک جائیں گے۔آخر گھر تو تمھارا ہے۔پہلے اس طوائف پر کیا کم لٹایا ہے۔تم عقل سے کام لو اور اسے گانے بجانے کے لیے ایک دن کے لیے یہاں بلالو۔بیٹے کی شادی کی خوشی بھی ہو جائے گی اور روپے بھی لٹنے سے بچ جائیں گے۔

شاہنی پہلے تو بھڑک کر بولی''میں اس کسبی کا منہ نہیں دیکھنا چاہتی''۔دوستوں نے اطمینان سے کچھ سوچ کر کہا''یہاں پر تو بھابھی تمھاری حکومت ہے،وہ تمھاری باندی بن کر آئے گی،تمھارے حکم کی غلام۔تمھارے بیٹے کی خوشی کی خاطر۔سبکی تو اس کی ہے،تمھارا کیا ہے؟جیسے کرمی کمین آئے،ڈوم میراثی،اسی طرح وہ بھی۔''

بات شاہنی کو پسند آگئی۔یوں بھی کبھی کبھی سوتے جاگتے اس کو خیال آتا تھا، ایک بار دیکھوں تو بھلا کیسی لگتی ہے؟اس نے کبھی اسے دیکھا نہ سنا لیکن خیالی خاکہ ضرور بنایا تھا۔بھلے سے ڈر کر،سہم کر یا نفرت سے۔شہر سے آتے جاتے اگر تانگے میں بیٹھی کسی طوائف کو دیکھتی تو،نہ سوچتے ہوئے بھی سوچنے لگتی''کیا معلوم وہی ہو۔''

''چلو،میں بھی ایک بار دیکھ لوں''من ہی من کھل سی گئی''اسے میرا جو بگاڑنا تھا سو بگاڑ لیا،اب اس سے زیادہ وہ میرا کیا کرلے گی۔ایک بار کم بخت کو دیکھ تو لوں۔''

اور شاہنی نے حامی بھر دی،لیکن ایک شرط لگادی''یہاں پر نہ شراب اڑے گی نہ کباب۔بھلے گھروں میں جس طرح گانا ہوتا ہے،اسی طرح گانا بجانا کراؤں گی۔آپ مرد لوگ بھی اسی محفل میں بیٹھ جانا۔وہ آئے اور سیدھی طرح گا کر لوٹ جائے۔میں وہی چار بتاشے اس کی جھولی میں بھی ڈال دوں گی جو دوسری لڑکیوں،بچیوں کو دوں گی۔وہ گھوڑیاں گائیں گی''۔

''یہی تو بھابھی ہم بھی کہہ رہے ہیں''۔سبھی نے ایک ساتھ کہا:''تمھاری ذہانت سے ہی تو گھر بنا ہوا ہے نہیں تو کیا معلوم کیا سے کیا ہوجاتا''۔

وہ آئی۔شاہنی نے خود اپنی بگھی بھیجی تھی۔گھر مہمانوں سے بھرا ہوا تھا۔بڑے کمرے میں جازم بچھا کر دیواروں کے بیچوں بیچ ڈھولکی رکھی ہوئی تھی۔گھر کی عورتوں نے گھوڑیاں شروع کر رکھی تھیں۔

تبھی دروازے کے آگے آ کر کھڑی ہو گئی۔تب مہمانوں میں جو عورتیں اور لڑکیاں اتاولی تھیں،بھاگ کر کھڑکیوں کی طرف چلی گئیں اور کچھ سیڑھیوں کی طرف۔

''اری! بدشگونی کیوں کرتی ہو،گھوڑی بیچ میں ہی ادھوری چھوڑ دی ہے۔''شاہنی نے کسی کو دبکا سا مارا۔لیکن اس کی آواز خود اسے مدھم سی لگی، جیسے اس کے دل میں ایک دھمک سی پڑی ہو۔

وہ سیڑھیاں چڑھ کر دروازے تک آگئی تھی۔شاہنی نے اپنی گلابی ساڑی کا دہرا کیا،جیسے سامنے دیکھنے کے لیے وہ ساڑی کے شگوفوں والے گلابی رنگ کا سہارا لے رہی ہو۔

سامنے اس نے ہرے رنگ کا بانگڑی والا غرارہ پہنا ہوا تھا۔گلے میں سرخ رنگ کی قمیص تھی اور سر سے پاؤں تک ڈھلتا ہوا سبز ریشم کا دوپٹہ۔ایک ہلچل سی ہوئی۔شاہنی کو ایک لمحے کے لیے لگا کہ جیسے سبز رنگ پورے دروازے میں پھیل گیا ہے۔

پھر کانچ کی چوڑیوں کی کھنک ہوئی اور شاہنی نے دیکھا ایک گورا ہاتھ جھکے ہوئے ماتھے سے چھو کر اس کی بندگی جیسا کچھ کہہ رہا ہے اور ساتھ ہی ایک کھنکتی سی آواز''بہت بہت مبارک شاہنی،بہت بہت مبارک''!

وہ ایک نازک شاخ جیسی تھی،پتلی،ہاتھ لگاتے ہی دہری ہوتی ہوئی۔شاہنی نے ایک گاؤ تکیے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے اسے بیٹھنے کے لیے کہا۔تب شاہنی کو محسوس ہوا کہ اس کے اپنے بازو بڑے بے ڈول لگ رہے ہیں۔

کمرے کے ایک کونے میں شاہ اور اس کے یار بھی تھے،رشتے داروں میں سے بھی کچھ مرد۔اس شاخ جیسی نے اس گوشے کی جانب دیکھ کر ادھر بھی سلام کے لیے ہاتھ اٹھایا اور پھر گاؤ تکیے کے ساتھ ٹھسکے سے بیٹھ گئی۔بیٹھتے

ہوئے اس کی کانچ کی چوڑیاں پھر کھنک گئی تھیں۔شاہنی نے پھر اس کے بازوؤں کی طرف دیکھا۔ہرے کانچ کی چوڑیوں کو اور پھر اپنی کلائیوں میں پڑی سونے کی چوڑیوں کی طرف دیکھنے لگی۔

کمرے میں ایک چکا چوندھ سی چھا گئی۔ہر کسی کی آنکھیں جیسے اسی کی طرف تک گئیں۔شاہنی کی اپنی آنکھیں بھی،لیکن اسے اپنی آنکھوں کو چھوڑ کر سب کی آنکھوں پر غصہ سا آ گیا۔وہ پھر ایک بار کہنا چاہتی تھی—اری بدشگونی کیوں کرتی ہو،گھوڑیاں گاؤ نا۔لیکن جیسے اس کی آواز اس کے گلے میں ہی پھنس گئی۔شاید اوروں کی آواز بھی ان کے گلے میں رُندھ گئی تھی۔کمرے میں ایک خاموشی سی چھا گئی۔وہ کمرے کے درمیان میں پڑی ڈھولک کی طرف دیکھنے لگی اور اس کی خواہش ہوئی کہ وہ بہت زور سے ڈھولکی بجائے۔

خاموشی اسی نے توڑی جس کی وجہ سے خاموشی چھائی تھی۔کہنے لگی—میں تو سب سے پہلے گھوڑی گاؤں گی—اور شاہنی کی طرف دیکھتے ہوئے ہنس کر گھوڑی شروع کر دی!

ننھی ننھی بوندیں ننھے مینہہ رے
تیری ماں سہاگن تیرے شگون کرے

شاہنی کو بے ساختہ جیسے سکون کا احساس ہوا۔شاید اس لیے کہ گیت میں آئی ماں یہی ہے اور اس کا مرد بھی صرف اسی کا مرد ہے،تبھی تو ماں سہاگن ہے۔

شاہنی اپنے چہرے پر ہنسی بکھیرتے ہوئے اس کے سامنے بیٹھ گئی جو اس وقت اس کے بیٹے کا شگون منا رہی تھی۔

گھوڑی ختم ہوئی تو کمرے کی حرکت واپس آ گئی۔سب کچھ پہلے جیسا ہو گیا۔عورتوں کی طرف سے فرمائش ہوئی ''ڈھولک روڑے والا گیت'' مردوں کی جانب سے فرمائش آ گئی ''مرزے کے بول!''

گانے والی نے مردوں کی فرمائش سنی،ان سنی کر دی اور ڈھولک کو اپنی طرف کھینچ کر اس نے ڈھولک کے ساتھ اپنا گھٹنا جوڑ دیا۔شاہنی کچھ رو میں آ گئی۔شاید اس لیے کہ گانے والی مردوں کی فرمائش کو ان دیکھا کر عورتوں کی فرمائش پوری کرنے لگی تھی۔

مہمان عورتوں میں سے شاید کچھ کو یہ معلوم نہیں تھا۔وہ ایک دوسرے سے کچھ پوچھ رہی تھیں،کئی اس کے کان کے پاس کچھ کہہ رہی تھیں'' وہی ہے شاہ کی رکھیل''! کہنے والیوں نے بھلے ہی بہت آہستہ سے کہا تھا لیکن شاہنی کے کانوں میں آواز پڑ گئی تھی،کانوں میں بج رہی تھی،'' شاہ کی رکھیل'' شاہ کی رکھیل،......اور شاہنی کے چہرے کا رنگ پھر کھل گیا۔

'' شوئے وہ چیرے والیہ اس میں کہنی آں۔''

اور شاہنی کا کلیجہ ٹھنڈا ہو گیا۔سوئے چیرے (لال پگڑی) والا میرا ہی بیٹا ہے— سکھی رہے گھوڑی چڑھنے والا میرا بیٹا......

فرمائشوں کا ایک لامتناہی سلسلہ تھا۔ایک گیت ختم ہوتا تو دوسرا گیت شروع ہو جاتا۔گانے والی کبھی خواتین کی فرمائش پوری کرتی کبھی مردوں کی۔بیچ بیچ میں یہ بھی کہہ دیتی'' کوئی اور بھی گاؤ نا! مجھے ذرا سانس تو لینے دو۔'' لیکن اس کے سامنے گانے کی کس کی ہمت تھی۔اس کی کھنکتی ہوک جیسی آواز! وہ بھی صرف کہنے کے لیے کہہ رہی تھی۔کیسے خود ہی ایک کے بعد دوسرا گیت فوراً چھیڑ دیتی تھی۔

گیتوں کی بات دوسری تھی،لیکن جب اس نے مرزے کی صدا لگائی— اٹھ نی صاحباں ستیئے، اٹھ کے دے دیدار— ہوا کا کلیجہ بھی دہل گیا۔اس نے ٹکٹکی باندھ کے شاہ کے چہرے کی طرف دیکھا۔شاہ بھی اور بتوں کی طرح بت بنا بیٹھا تھا،لیکن شاہنی کو لگا جیسے وہ پتھر کا ہو گیا ہے۔

شاہنی کے کلیجے میں تذبذب تھا اور اسے لگا کہ اگر یہ پل نکل گیا تو وہ خود بھی ہمیشہ کے لیے مٹی کا بت بن جائے گی۔وہ کرے،کچھ کرے،کچھ تو کرے،لیکن مٹی کا بت نہ بنے۔

شام گھر آئی۔محفل اختتام پر تھی۔

شاہنی کا کہنا تھا کہ وہ آج اسی طرح صرف بتاشے بانٹنے گی جیسے دوسرے ایسے موقعوں پر تقسیم کرتے ہیں۔لیکن جب گیت کی محفل ختم ہوئی تو کمرے میں بھانت بھانت کی مٹھائیوں کے ساتھ چائے آ گئی اور شاہنی نے مٹھی میں پکڑا ہوا سو روپے کا نوٹ اپنے بیٹے کے سر پر وار کر اسے پکڑا دیا، جسے لوگ شاہ کی رکھیل کہہ رہے تھے۔

'' رہنے دو شاہنی! پہلے ہی تیرا ہی دیا کھاتی ہوں''۔اس نے انکار کیا اور ہنس پڑی۔اس کی ہنسی اس کے روپ کی طرح چمک رہی تھی۔

شاہنی کا چہرہ بجھ گیا۔اسے لگا جیسے شاہ کی رکھیل نے آج بھری محفل میں شاہ کے ساتھ اپنا رشتہ جوڑ کر اس کی بے عزتی کر دی ہے۔لیکن شاہنی نے خود کو سنبھال لیا۔اطمینان کیا کہ آج اسے ہار نہیں ماننی ہے اور وہ زور سے ہنس دی۔نوٹ دیتے ہوئے کہنے لگی،'' شاہ سے تو نے نت لینا ہے لیکن مجھ سے تو نے پھر کب لینا ہے،چل آج لے لے''۔

اور شاہ کی رکھیل سو کے نوٹ کو پکڑتی ایک دم بے بس ہو گئی۔

کمرے میں شاہنی کی ساڑی کا شگونوں والا گلابی رنگ پھیل گیا۔!!

□□□

رابطہ مترجم:
F-58, Sector-40
Noida-201301 (U.P.)

نظیر اکبرآبادی

دیوالی کے پُر مسرت موقعے پر

دوالی

ہر اک مکاں میں، جلا پھر دیا دوالی کا
ہر اک طرف کو اُجالا ہوا دوالی کا
سبھی کے دل میں سماں بھا گیا دوالی کا
کسی کے دل کو مزا خوش لگا دوالی کا
عجب بہار کا ہے دن بنا دوالی کا

جہاں میں یارو عجب طرح کا ہے یہ تیوہار
کسی نے نقد لیا اور کوئی کرے ہے ادھار
کھلونوں، کھیلوں، بتاشوں کا گرم ہے بازار
ہر اک دکاں میں چراغوں کی ہو رہی ہے بہار
سبھوں کو فکر ہے اب جابجا دوالی کا

مٹھائیوں کی دکانیں لگا کے حلوائی
پکارتے ہیں کہ لالہ دوالی ہے آئی
بتاشے لے کوئی، برفی کسی نے تلوائی
کھلونے والوں کی ان سے زیادہ بن آئی
گویا انھوں کے واں راج آ گیا دوالی کا

مکان لیپ کے ٹھلیا جو کوری رکھوائی
جلا چراغ کو، کوڑی وہ جلد جھنکائی
اصل جواری تھے ان میں تو جان سی آئی
خوشی سے کود اچھل کر پکارے او بھائی
شگون پہلے کرو تم ذرا دوالی کا

کسی نے گھر کی حویلی گرو رکھا ہاری
جو کچھ تھی جنس میسر بنا بنا ہاری
کسی نے چیز کسی کی چرا چھپا ہاری
کسی نے گٹھری پڑوسن کی اپنی لا ہاری
یہ ہار جیت کا چرچا پڑا دوالی کا

کسی کو داؤ پہ لاٹھی موٹھ نے مارا
کسی کے گھر پہ دھرا سوختہ سے انگارا
کسی کو نرد نے چوپڑ کے کر دیا زارا
لنگوٹی باندھ کے بیٹھا، ازار تک ہارا
یہ شور آ کے مچا جا بجا دوالی کا

کسی کی جورو کہے ہے پکار، دے بھڑوے
بہو کی نوگر ہی، بیٹے کے ہاتھ کے کھڑوے
جو گھر میں آوے تو سب مل کہے ہیں سو کھڑوے
نکل تو یاں سے ترا کام یاں نہیں بھڑوے
خدا نے تجھ کو تو ٹھہرا کیا دوالی کا

وہ اس کے جھونٹے پکڑ کر کہے ہے ماروں گا
ترا جو گہنا ہے سب تار تار اتاروں گا
حویلی اپنی تو اک داؤ پر میں ہاروں گا
یہ سب تو ہارا ہوں خندی تجھے بھی ہاروں گا
چڑھا ہے مجھ کو بھی اب تو نشا دوالی کا

تجھے خبر نہیں خندی یہ لت وہ پیاری ہے
کسی زمانے میں آگے ہوا جو جواری ہے
تو اس نے جورو کی نتھ اور ازار اتاری ہے
ازار کیا ہے کہ جورو تلک بھی ہاری ہے
سنا یہ تونے نہیں ماجرا دوالی کا

جہاں میں یہ جو دوالی کی سیر ہوتی ہے
تو زر سے ہوتی ہے اور زر بغیر ہوتی ہے
جو ہارے ان پہ خرابی کی فیر ہوتی ہے
اور ان میں آن کے جن جن کی خیر ہوتی ہے
تو آڑے آتا ہے ان کے دیا دوالی کا

یہ باتیں سچ ہیں، نہ جھوٹ ان کو جانیو یارو
نصیحتیں ہیں، انھیں دل میں ٹھانیو یارو
جہاں کو جاؤ یہ قصہ بکھانیو یارو
جو جواری ہو، نہ برا اس کا مانیو یارو
نظیر آپ بھی ہے جواریا دوالی کا

□□□

عیدالفطر کے مبارک موقعے پر

پریم چند

عیدگاہ

رمضان کے پورے تیس روزوں کے بعد آج عید آئی ہے۔ کتنی سہانی اور رنگین صبح ہے۔ بچے کی طرح پر تبسم، درختوں پر کچھ عجیب ہریالی ہے۔ کھیتوں میں کچھ عجیب رونق ہے۔ آسمان پر کچھ عجیب فضا ہے۔ آج کا آفتاب دیکھو کتنا پیارا ہے، گویا دنیا کو عید کی خوشی پر مبارکباد دے رہا ہے۔ گاؤں میں کتنی چہل پہل ہے۔ عیدگاہ جانے کی دھوم ہے۔ کسی کے کرتے میں بٹن نہیں ہیں تو سوئی تاگا لینے دوڑا جا رہا ہے۔ کسی کے جوتے سخت ہو گئے ہیں اسے تیل اور پانی سے نرم کر رہا ہے۔ جلدی جلدی بیلوں کو سانی پانی دے دیں، عیدگاہ سے لوٹتے لوٹتے دوپہر ہو جائے گی۔ تین کوس کا پیدل راستہ پھر سیکڑوں رشتے قرابت والوں سے ملنا ملانا۔ دوپہر سے پہلے لوٹنا غیر ممکن ہے۔ لڑکے سب سے زیادہ خوش ہیں۔ کسی نے ایک روزہ رکھا، وہ بھی دوپہر تک۔ کسی نے وہ بھی نہیں۔ لیکن عیدگاہ جانے کی خوشی ان کا حصہ ہے۔ روزے بڑے بوڑھوں کے لیے ہوں گے، بچوں کے لیے تو عید ہے۔ روز عید کا نام رٹتے تھے، آج وہ آ گئی۔

اب جلدی پڑی ہوئی ہے کہ عیدگاہ کیوں نہیں چلتے۔ انھیں گھر کی فکروں سے کیا واسطہ؟ سوئیوں کے لیے گھر میں دودھ، شکر اور میوے ہیں یا نہیں۔ اس کی انھیں کیا فکر۔ وہ کیا جانیں ابا کیوں بدحواس گاؤں کے مہاجن چودھری قاسم علی کے گھر دوڑے جا رہے ہیں۔ ان کی اپنی جیبوں میں تو قارون کا خزانہ رکھا ہوا ہے۔ بار بار جیب سے اپنا خزانہ نکال کر گنتے ہیں۔ دوستوں کو دکھاتے ہیں اور خوش ہو کر رکھ لیتے ہیں۔ ان ہی دو چار پیسوں میں دنیا کی ساری نعمتیں لائیں گے۔ کھلونے اور مٹھائیاں اور بگل۔ اور خدا جانے کیا کیا۔ اور سب سے زیادہ خوش ہے حامد۔ وہ چار سال کا غریب صورت بچہ ہے۔ جس کا باپ پچھلے سال ہیضے کی نذر ہو گیا اور ماں نہ جانے کیوں زرد ہوتی ہوتی ایک دن مر گئی۔ کسی کو پتہ نہ چلا کیا بیماری ہے۔ کہتی کس سے، کون سننے والا تھا۔ دل پر جو گزرتی تھی، سہتی تھی اور جب نہ سہا گیا تو دنیا سے رخصت ہو گئی۔ اب حامد اپنی بوڑھی دادی امینہ کی گود میں سوتا ہے اور اتنا ہی خوش ہے۔ اس کے ابا جان بڑی دور روپئے کمانے گئے ہیں۔ بہت سی تھیلیاں لے کر آئیں گے۔ امی جان اللہ میاں کے گھر مٹھائی لینے گئی ہیں۔ اس لیے خاموش ہے۔ حامد کے پاؤں میں جوتے نہیں ہیں۔ سر پر ایک پرانی دھرانی ٹوپی ہے۔ جس کا گوٹا سیاہ ہو گیا ہے۔ پھر بھی وہ خوش ہے۔ جب اس کے ابا جان تھیلیاں اور اماں جان نعمتیں لے کر آئیں گی تب وہ دل کے ارمان نکالے گا۔ تب دیکھے گا کہ محمود اور محسن، نور اور سمیع کہاں سے اتنے پیسے لاتے ہیں۔ دنیا اپنی مصیبتوں کی ساری فوج لے کر آئے، اس کی ایک نگاہ معصوم اسے پامال کرنے کے لیے کافی ہے۔

حامد اندر جا کر امینہ سے کہتا ہے۔ "تم ڈرنا نہیں اماں، میں گاؤں والوں کا ساتھ نہ چھوڑوں گا۔ بالکل نہ ڈرنا۔" لیکن امینہ کا دل نہیں مانتا۔ گاؤں کے بچے اپنے اپنے باپ کے ساتھ جا رہے ہیں۔ حامد کیا اکیلا ہی جائے گا۔ اس بھیڑ بھاڑ میں کہیں کھو جائے تو کیا ہو۔ نہیں امینہ اسے تنہا نہ جانے دے گی۔ ننھی سی جان۔ تین کوس چلے گا، پاؤں میں چھالے نہ پڑ جائیں گے۔

مگر وہ چلی جائے تو یہاں سوئیاں کون پکائے گا۔ بھوکا پیاسا دوپہر کو لوٹے گا۔ کیا اس وقت سوئیاں پکانے بیٹھے گی۔ رونا تو یہ ہے کہ امینہ کے پاس پیسے نہیں ہیں۔ اس نے فہمن کے کپڑے سیے تھے۔ آٹھ آنے پیسے ملے تھے۔ اس اٹھنی کو ایمان کی طرح بچاتی چلی آئی تھی اس عید کے لیے، لیکن کل گھر میں اور پیسے نہ تھے اور گوالن کے پیسے چڑھ گئے تھے۔ دینے پڑے۔ حامد کے لیے روز دو پیسے کا دودھ تو لینا پڑتا ہے۔ اب کل دو آنے پیسے بچ رہے ہیں۔ تین پیسے حامد کی جیب میں اور پانچ امینہ کے بٹوے میں۔ یہی بساط ہے۔ اللہ ہی بیڑا پار کرے۔ دھوبن، مہترانی اور نائن سبھی تو آئیں گی۔ سب کو سوئیاں چاہئیں۔ کس کس سے منہ چھپائے؟ سال بھر کا تہوار ہے۔ زندگی خیریت سے رہے۔ ان کی تقدیر بھی تو اس کے ساتھ ہے۔ بچے کو خدا سلامت رکھے۔ یہ

اردو فکشن کے بنیاد گزاروں میں منشی پریم چند کا نام سرِفہرست ہے جنھوں نے ناول اور مختصر افسانے کی اصناف کو نہ صرف فروغ دیا بلکہ انہیں وقار اور اعتبار بھی بخشا۔ منشی پریم چند کی ادبی سرگرمیوں کا آغاز اردو سے ہوا تھا، پھر وہ ہندی میں بھی لکھنے لگے اور وہاں بھی اپنے عہد کی سب سے بڑی ادبی شخصیت کہلائے۔ کونسل نے پریم چند کی تمام تحریریں اس کلیات میں مجتمع کر دی ہیں جو 24 جلدوں پر مشتمل ہے۔ اسے مدن گوپال نے ترتیب دیا ہے۔ مکمل سیٹ کی قیمت -/4071 روپئے ہے۔ 30 نومبر 2006 تک کلیات پریم چند پر 75% کی خصوصی رعایت دی جا رہی ہے۔

دن بھی یوں ہی کٹ جائیں گے۔

گاؤں سے لوگ چلے، اور بچوں کے ساتھ حامد بھی تھا۔ سب کے سب دوڑ کر آگے نکل جاتے، پھر کسی درخت کے نیچے کھڑے ہو کر ساتھ والوں کا انتظار کرتے۔ یہ لوگ کیوں اتنے آہستہ آہستہ چل رہے ہیں؟

شہر کا سواد شروع ہو گیا۔ سڑک کے دونوں طرف امیروں کے باغ ہیں۔ پختہ چہار دیواری بنی ہوئی ہے۔ درختوں میں آم لگے ہوئے ہیں۔ حامد نے ایک کنکری اٹھا کر ایک آم پر نشانہ لگایا۔ مالی اندر سے گالی دیتا ہوا باہر آیا۔ بچے وہاں سے ایک فرلانگ پر ہیں۔ خوب ہنس رہے ہیں۔ مالی کو کیسا الو بنایا۔

بڑی بڑی عمارتیں آنے لگیں۔ یہ عدالت ہے، یہ مدرسہ ہے، یہ کلب گھر ہے۔ اتنے بڑے مدرسہ میں کتنے سارے لڑکے پڑھتے ہوں گے۔ لڑکے نہیں ہیں جی۔ بڑے بڑے آدمی ہیں۔ سچ ان کی بڑی بڑی مونچھیں ہیں۔ اتنے بڑے ہو گئے، اب تک پڑھتے جاتے ہیں۔ آج تو چھٹی ہے۔ لیکن ایک بار جب پہلے آئے تھے تو بہت سی داڑھی مونچھوں والے لڑکے یہاں کھیل رہے تھے۔ نہ جانے کب تک پڑھیں گے اور کیا کریں گے اتنا پڑھ کر۔ گاؤں کے دیہاتی مدرسے میں دو تین بڑے بڑے لڑکے ہیں۔ بالکل کور ذہن غبی۔ کام سے جی چرانے والے۔ یہ لڑکے بھی اسی طرح کے ہوں گے جی۔ اور کیا نہیں۔ کیا اب تک پڑھتے ہوتے۔ وہ کلب گھر ہے۔ وہاں جادو کا کھیل ہوتا ہے۔ سنا ہے مردوں کی کھوپڑیاں اڑتی ہیں۔ آدمی کو بے ہوش کر دیتے ہیں۔ پھر اس سے جو کچھ پوچھتے ہیں، وہ سب بتلا دیتا ہے اور بڑے بڑے تماشے ہوتے ہیں اور میمیں بھی کھیلتی ہیں۔ سچ، ہماری اماں کو وہ دے دو۔ کیا کہلاتا ہے ''بیٹ'' تو اسے گھماتے ہی لڑھک جائیں۔

محسن نے کہا۔ ''ہماری امی جان تو اسے پکڑ ہی نہ سکیں۔ ہاتھ کانپنے لگے اللہ قسم۔''

حامد نے اس سے اختلاف کیا۔ ''چلو، منوں آٹا پیس ڈالتی ہیں۔ ذرا سی بیٹ پکڑ لیں گی تو ہاتھ کانپنے لگے گا۔ سیکڑوں گھڑے پانی روز نکالتی ہیں۔ کسی میم کو ایک گھڑا پانی نکالنا پڑے تو آنکھوں تلے اندھیرا آ جائے۔

محسن۔ ''لیکن دوڑتی تو نہیں، اچھل کود نہیں سکتیں۔''

حامد۔ ''کام آ پڑتا ہے تو دوڑ بھی لیتی ہیں۔ ابھی اس دن تمھاری گائے کھل گئی تھی اور چودھری کے کھیت میں جا پڑی تھی۔ تو تمھاری اماں ہی تو دوڑ کر اسے بھگا لائی تھیں۔ کتنی تیزی سے دوڑی تھیں۔ ہم تم دونوں ان سے پیچھے رہ گئے۔''

پھر آگے چلے۔ حلوائیوں کی دکانیں شروع ہوئیں۔ آج خوب سجی ہوئی تھیں، اتنی مٹھائیاں کون کھاتا ہے؟ دیکھو نا، ایک ایک دکان پر منوں ہوں گی۔ سنا ہے رات کو ایک جنات ہر ایک دکان پر جاتا ہے۔ جتنا مال بچا ہوتا ہے وہ سب خود خرید لیتا ہے اور سچ مچ کے روپے دیتا ہے۔ بالکل ایسے ہی چاندی کے روپے۔

محمود کو یقین نہ آیا۔ ''ایسے روپے جنات کو کہاں سے مل جائیں گے۔''

محسن۔ ''جنات کو روپوں کی کیا کمی؟ جس خزانے میں چاہیں، چلے جائیں۔ کوئی نہیں دیکھ سکتا۔ لوہے کے دروازے تک نہیں روک سکتے جناب، آپ ہیں کس خیال میں۔ ہیرے جواہرات ان کے پاس رہتے ہیں۔ جس سے خوش ہو گئے اسے ٹوکروں جواہرات دے دیے۔ پانچ منٹ میں کہو کابل پہنچ جائیں۔''

حامد۔ ''جنات بہت بڑے ہوتے ہوں گے۔''

محسن۔ ''اور کیا۔ ایک ایک آسمان کے برابر ہوتا ہے۔'' زمین پر کھڑا ہو جائے، اس کا سر آسمان سے جا لگے۔ مگر چاہے تو ایک لوٹے میں گھس جائے۔''

سمیع۔ ''سنا ہے چودھری صاحب کے قبضے میں بہت سے جنات ہیں، کوئی چیز چوری چلی جائے، چودھری صاحب اس کا پتہ بتا دیں گے اور چور کا نام تک بتا دیں گے۔ جمعراتی کا بچھڑا اس دن کھو گیا تھا۔ تین دن حیران ہوئے کہیں نہ ملا۔ تب جھک مار کر چودھری کے پاس گئے۔ چودھری نے کہا مویشی خانے میں ہے اور وہیں ملا۔ جنات آکر انھیں سب خبریں دے جایا کرتے ہیں۔''

اب ہر ایک کی سمجھ میں آ گیا کہ چودھری قاسم علی کے پاس کیوں اس قدر دولت ہے اور کیوں وہ قرب و جوار کے مواضعات کے مہاجن ہیں۔ جنات آکر انھیں روپے دے جاتے ہیں۔ آگے چلے۔ یہ پولیس لائن ہے۔ یہاں پولیس والے قواعد کرتے ہیں۔ رائٹ، لپ، ہام، پھو۔!

نوری نے تصحیح کی۔ ''یہاں پولیس والے پہرہ دیتے ہیں۔ جب ہی تمھیں بہت خبر ہے۔ اجی حضرت! یہ لوگ چوریاں کراتے ہیں۔ شہر کے جتنے چور ڈاکو ہیں۔ سب ان سے ملے رہتے ہیں۔ رات کو یہ سب ایک محلّے میں چوروں سے کہتے ہیں، چوری کرو اور دوسرے محلے میں پکارتے ہیں، جاگتے رہو۔ میرے ماموں ایک تھانے میں سپاہی ہیں۔ بیس روپے مہینہ پاتے ہیں، لیکن تھیلیاں بھر بھر کے بھیجتے ہیں۔ اللہ قسم تھیلیاں بھر بھر کے۔ میں نے ایک بار پوچھا تھا۔ ماموں اتنے روپے آپ کہاں سے لاتے ہیں۔ ہنس کر کہنے لگے۔ بیٹا اللہ دیتا ہے۔ خود ہی بعد کو کہا کہ ہم لوگ چاہیں تو ایک دن میں لاکھوں مار لائیں۔ ہم تو اتنا ہی لیتے ہیں جس میں اپنی بدنامی نہ ہو اور نوکری بنی رہے۔

حامد نے تعجب سے پوچھا۔ ''یہ لوگ چوری کراتے ہیں تو انھیں کوئی پکڑتا نہیں۔

نوری نے اس کی کوتاہ فہمی پر رحم کھا کر کہا۔ ''ارے احمق۔ انھیں کون

پکڑے گا۔ پکڑنے والے تو یہ خود ہیں۔ لیکن اللہ انھیں سزا بھی خوب دیتا ہے۔ تھوڑے دن ہوئے ماموں کے گھر میں آگ لگ گئی۔ سارا مال متاع جل گیا۔ ایک برتن تک نہ بچا۔ کئی دن تک درخت کے نیچے سوئے اللہ قسم! پھر نہ جانے کہاں سے قرض لائے تو برتن بھانڈے آئے۔''

بستی گھنی ہونے لگی۔ عیدگاہ جانے والوں کے مجمعے نظر آنے لگے۔ ایک سے ایک زرق برق پوشاک پہنے ہوئے۔ کوئی تانگے پر سوار، کوئی موٹر پر، چلتے تھے، تو کپڑوں سے عطر کی خوشبو اڑتی تھی۔

دہقانوں کی یہ مختصر سی ٹولی اپنی بے سروسامانی سے بے حس، اپنی خستہ حالی میں مگن صابر و شاکر چلی جاتی تھی۔ جس چیز کی طرف تاکتے، تاکتے رہ جاتے اور پیچھے سے بار بار ہارن کی آواز ہونے پر بھی خبر نہ ہوتی۔ محسن تو موٹر کے نیچے جاتے جاتے بچا۔

وہ عیدگاہ نظر آئی۔ جماعت شروع ہو گئی ہے۔ اوپر املی کے گھنے درختوں کا سایہ ہے، نیچے کھلا ہوا پختہ فرش ہے، جس پر جاجم بچھا ہوا ہے۔ اور نمازیوں کی قطاریں ایک کے پیچھے دوسری۔ خدا جانے کہاں تک چلی گئی ہیں۔ پختہ فرش کے نیچے جاجم بھی نہیں۔ کئی قطاریں کھڑی ہیں، جو آتے جاتے ہیں، پیچھے کھڑے ہوتے جاتے ہیں۔ آگے اب جگہ نہیں رہی۔ یہاں کوئی رتبہ اور عہدہ نہیں دیکھتا۔ اسلام کی نگاہ میں سب انسان برابر ہیں۔ دہقانوں نے بھی وضو کیا۔ اور جماعت میں شامل ہو گئے۔ کتنی باقاعدہ منظم جماعت ہے۔ لاکھوں آدمی ایک ساتھ جھکتے ہیں۔ ایک ساتھ دوزانو بیٹھ جاتے ہیں اور یہ عمل بار بار ہوتا ہے۔ ایسا معلوم ہو رہا ہے، گویا بجلی کی لاکھوں بتیاں ایک ساتھ روشن ہو جائیں اور ایک ساتھ بجھ جائیں۔ کتنا پراحترام رعب انگیز نظارہ ہے۔ جس سے ہم آہنگی اور وسعت اور تعداد دلوں پر ایک وجدانی کیفیت پیدا کر دیتی ہے۔ گویا اخوت کا ایک رشتہ ان تمام روحوں کو منسلک کیے ہوئے ہے۔

(2)

نماز ختم ہو گئی ہے۔ لوگ باہم مل رہے ہیں۔ کچھ لوگ محتاجوں اور سائلوں کو خیرات کر رہے ہیں۔ جو آج یہاں ہزاروں جمع ہو گئے ہیں۔ ہمارے دہقانیوں نے مٹھائی اور کھلونوں کی دکانوں پر یورش کی۔ بوڑھے ان دلچسپیوں میں بچوں سے کم محظوظ نہیں ہیں۔ یہ دیکھو ہنڈولا ہے۔ ایک پیسہ دے کر آسمان پر جاتے معلوم ہو گئے۔ کبھی زمین پر گرتے۔ یہ چرخی ہے۔ لکڑی کے گھوڑے، اونٹ، ہاتھی میخوں سے لٹکے ہوئے ہیں۔ ایک پیسہ دے کر بیٹھ جاؤ اور پچیس چکروں کا مزا لو۔ محمود اور محسن ہنڈولے پر بیٹھے ہیں۔ نور اور سمیع گھوڑوں پر۔ ان کے بزرگ اتنے ہی طفلانہ اشتیاق سے چرخی پر بیٹھے ہیں۔ حامد دور کھڑا ہے۔ تین ہی پیسے تو اس کے پاس ہیں۔ ذرا سا چکر کھانے کے لیے وہ اپنے خزانے کا ثلث نہیں صرف کر سکتا۔ محسن کا باپ اسے بار بار چرخی پر بلاتا ہے، لیکن وہ راضی نہیں ہوتا۔ بوڑھے کہتے ہیں، اس لڑکے میں ابھی سے اپنا پرایا آ گیا۔ حامد سوچتا ہے، کیوں کسی کا احسان لوں۔ عسرت نے اسے ضرورت سے زیادہ ذکی الحس بنا دیا ہے۔

سب لوگ چرخی سے اترتے ہیں۔ کھلونوں کی خرید شروع ہوتی ہے۔ سپاہی اور گجریا اور راجہ رانی اور وکیل اور دھوبی اور بھشتی بے امتیاز ران سے ران ملائے بیٹھے ہیں۔ دھوبی راجہ رانی کی بغل میں ہے۔ اور بھشتی وکیل صاحب کی بغل میں۔ واہ کتنے خوبصورت، بولا ہی چاہتے ہیں۔ محمود سپاہی پر لٹو ہو جاتا ہے۔ خاکی وردی اور لال پگڑی۔ کندھے پر بندوق۔ معلوم ہوتا ہے ابھی قواعد کے لیے چلا آ رہا ہے۔ محسن کو بھشتی پسند آیا۔ کمر جھکی ہوئی ہے۔ اس پر مشک کا دہانہ ایک ہاتھ سے پکڑے ہوئے ہے۔ دوسرے ہاتھ میں رسی ہے۔ کتنا بشاش چہرہ ہے۔ شاید کوئی گیت گا رہا ہے۔ مشک سے پانی ٹپکتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ نوری کو وکیل سے مناسبت ہے۔ کتنی عالمانہ صورت ہے۔ سیاہ چغہ نیچے سفید اچکن، اچکن کے سینہ کی جیب میں سنہری زنجیر، ایک ہاتھ میں قانون کی کتاب لیے ہوئے ہے۔ معلوم ہوتا ہے ابھی کسی عدالت سے جرح یا بحث کر کے چلے آ رہے ہیں۔ یہ سب دو دو پیسے کے کھلونے ہیں۔ حامد کے پاس کل تین پیسے ہیں۔ اگر دو کا ایک کھلونا لے لے تو پھر اور کیا لے گا۔ نہیں، کھلونے فضول ہیں، کہیں ہاتھ سے گر پڑے تو چور چور ہو جائے۔ ذرا سا پانی پڑ جائے تو سارا رنگ دھل جائے۔ ان کھلونوں کو لے کر وہ کیا کرے گا۔ کس مصرف کے ہیں۔

محسن کہتا ہے۔ ''میرا بھشتی روز پانی دے جائے گا صبح و شام۔''

محمود۔ ''اور میرا سپاہی گھر کا پہرہ دے گا۔ کوئی چور آئے گا تو فوراً بندوق سے فائر کر دے گا۔''

نوری۔ ''اور میرا وکیل روز مقدمے لڑائے گا۔ اور روز روپے لائے گا۔''

حامد کھلونوں کی مذمت کرتا ہے۔ مٹی ہی کے تو ہیں۔ گریں تو چکنا چور ہو جائیں۔ وہ ہر چیز کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہا ہے۔ اور چاہتا ہے کہ ذرا دیر کے لیے ہی ہاتھ میں لے سکتا۔ یہ بساطی کی دکان ہے طرح طرح کی ضروری چیزیں، ایک اور بچھی ہوئی ہیں۔ گیند، سیٹیاں، بگل، بھونپرے، ربڑ کے کھلونے اور ہزاروں چیزیں۔ محسن ایک سیٹی لیتا ہے۔ محمود گیند، نوری ربڑ کا بط جو چوں چوں کرتا ہے اور سمیع ایک بانسری۔ اسے بجا بجا کر وہ گائے گا۔ حامد کھڑا ہر ایک کو حسرت سے دیکھ رہا ہے۔ جب اس کے رفیق کوئی چیز خرید لیتے ہیں تو وہ بڑے اشتیاق سے ایک بار اسے ہاتھ میں لے کر دیکھنے کے لیے لپکتا ہے۔ لیکن لڑکے اتنے دوست نواز نہیں ہوتے۔ خاص کر جب کہ ابھی

لسی ،تازہ ہے۔ بچارا یوں ہی مایوس ہو کر رہ جاتا ہے۔

کھلونوں کے بعد مٹھائیوں کا نمبر آیا۔ کسی نے ریوڑیاں لی ہیں۔ کسی نے گلاب جامن۔ کسی نے سوہن حلوا۔ مزے سے کھا رہے ہیں۔ حامد ان کی برادری سے خارج ہے۔ کم بخت کی جیب میں تین پیسے تو ہیں۔ کیوں نہیں کچھ لے کر کھاتا۔ حریص نگاہوں سے سب کی طرف دیکھتا ہے۔

محسن نے کہا۔ " حامد یہ ریوڑی لے جا کتنی خوشبودار ہیں؟"

حامد سمجھ گیا یہ محض شرارت ہے۔ محسن اتنا فیاض طبع نہ تھا، پھر بھی وہ اس کے پاس گیا۔ محسن نے دونے سے دو تین ریوڑیاں نکالیں۔ حامد کی طرف بڑھائیں۔ حامد نے ہاتھ پھیلایا۔ محسن نے ہاتھ کھینچ لیا اور ریوڑیاں اپنے منھ میں رکھ لیں۔ محمود اور نور اور سمیع خوب تالیاں بجا بجا کر ہنسنے لگے۔ حامد کھسیانا ہو گیا۔

محسن نے کہا۔ " اچھا اب ضرور دیں گے۔ یہ لے جاؤ حامد اللہ قسم۔"

حامد نے کہا۔ " رکھیے رکھیے۔ کیا میرے پاس پیسے نہیں ہیں؟"

سمیع بولا۔ " تین ہی پیسے تو ہیں۔ کیا کیا لو گے؟"

محمود۔ " تم اس سے مت بولو۔ حامد میرے پاس آؤ۔ یہ گلاب جامن لے لو!

حامد۔ " مٹھائی کون بڑی نعمت ہے۔ کتاب میں اس کی برائیاں لکھی ہیں۔

محسن۔ " لیکن جی میں کہہ رہے ہو گے کہ کچھ مل جائے تو کھا لیں۔ اپنے پیسے کیوں نہیں نکالتے۔"

محمود۔ " میں اس کی ہوشیاری سمجھتا ہوں۔ جب ہمارے سارے پیسے خرچ ہو جائیں گے، تب یہ مٹھائی لے گا اور ہمیں چڑھا کر کھائے گا۔"

حلوائیوں کی دکانوں کے آگے کچھ دکانیں لوہے کی چیزوں کی تھیں۔ کچھ گلٹ اور ملمع کے زیورات کی۔ لڑکوں کے لیے یہاں دلچسپی کا کوئی سامان نہ تھا۔ حامد لوہے کی دکان پر ایک لمحے کے لیے رک گیا۔ دست پناہ رکھے ہوئے تھے۔ وہ دست پناہ خریدے گا۔ اماں کے پاس دست پناہ نہیں ہے۔ توے سے روٹیاں اتارتی ہیں تو ہاتھ جل جاتا ہے، اگر وہ دست پناہ لے جا کر اماں کو دے دے تو وہ کتنی خوش ہوں گی۔ پھر ان کی انگلیاں کبھی نہ جلیں گی۔ گھر میں ایک کام کی چیز ہو جائے گی۔ کھلونوں سے کیا فائدہ، مفت میں پیسے خراب ہوتے ہیں۔ ذرا دیر ہی تو خوشی ہوتی ہے۔ پھر تو انھیں کوئی آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا۔ یا تو گھر پہنچتے پہنچتے ٹوٹ پھوٹ کر برابر ہو جائیں گے یا چھوٹے بچے جو عیدگاہ نہیں جا سکے ہیں۔ ضد کر کے لے لیں گے اور توڑ ڈالیں گے۔ دست پناہ کتنے فائدے کی چیز ہے! روٹیاں توے سے اتار لو۔ چولھے سے آگ نکال کر دے دو۔ اماں کو کہاں فرصت ہے بازار آئیں اور اتنے پیسے کہاں ملتے ہیں۔ روز ہاتھ جلا لیتی ہیں۔ اس کے ساتھی آگے بڑھ گئے ہیں۔ سبیل پر سب کے سب پانی پی رہے ہیں۔ کتنے لالچی ہیں۔ سب نے اتنی مٹھائیاں لیں۔ کسی نے مجھے ایک بھی نہ دی۔ اس پر کہتے ہیں میرے ساتھ کھیلو، میری تختی دھو لاؤ۔ اب اگر میاں محسن نے کوئی کام کرنے کو کہا تو خبر لوں گا۔ کھائیں مٹھائیاں، آپ منہ نہ لگا۔ پھوڑے پھنسیاں نکلیں گی۔ آپ ہی چٹوری زبان ہو جائے گی۔ تب پیسے چرائیں گے اور مار کھائیں گے۔ میری زبان کیوں خراب ہو گی۔ اس نے پھر سوچا، اماں دست پناہ دیکھتے ہی دوڑ کر میرے ہاتھ سے لے لیں گی اور کہیں گی میرا بیٹا اپنی اماں کے لیے دست پناہ لایا ہے۔ ہزاروں دعائیں دیں گی۔ پھر اسے پڑوسیوں کو دکھائیں گی۔ سارے گاؤں میں واہ وا مچ جائے گی۔ ان لوگوں کے کھلونوں پر کون انھیں دعائیں دے گا۔ بزرگوں کی دعائیں سیدھی خدا کی درگاہ میں پہنچتی ہیں، اور فوراً قبول ہوتی ہیں۔ میرے پاس بہت سے پیسے نہیں ہیں، جب ہی تو محسن اور محمود یوں مزاج دکھاتے ہیں۔ میں بھی ان کو مزاج دکھاؤں گا وہ کھلونے کھیلیں۔ مٹھائیاں کھائیں۔ میں غریب سہی۔ کسی سے کچھ مانگنے تو نہیں جاتا۔ آخر ابا کبھی نہ کبھی آئیں گے ہی۔ پھر ان لوگوں سے پوچھوں گا، کتنے کھلونے لو گے۔ ایک ایک کو ایک ایک ٹوکری دوں۔ اور دکھا دوں کہ دوستوں کے ساتھ اس طرح سلوک کیا جاتا ہے۔ جتنے غریب لڑکے ہیں، سب کو اچھے اچھے کرتے دلوا دوں گا۔ اور کتابیں دے دوں گا۔ یہ نہیں کہ ایک پیسہ کی ریوڑیاں لیں، تو چڑھا چڑھا کر کھانے لگے۔ دست پناہ دیکھ کر سب کے سب خوب ہنسیں گے۔ احمق تو ہیں ہی سب۔

اس نے ڈرتے ڈرتے دکاندار سے پوچھا۔ " یہ دست پناہ بیچو گے؟"

دکاندار نے اس کی طرف دیکھا اور ساتھ کوئی آدمی نہ دیکھ کر کہا۔ " وہ تمھارے کام کا نہیں ہے۔"

" بکاؤ ہے یا نہیں؟"

" بکاؤ ہے جی۔ اور یہاں کیوں لاد کر لانے ہیں۔"

" تو بتلاتے کیوں نہیں، کے پیسے کا دو گے؟"

" چھ پیسے لگیں گے۔"

حامد کا دل بیٹھ گیا۔ کلیجہ مضبوط کر کے بولا۔ " تین پیسے لو گے؟" اور آگے بڑھا کہ دکاندار کی گھڑکیاں نہ سنے۔ مگر دکاندار نے گھڑکیاں نہ دیں۔ دست پناہ اس کی طرف بڑھا دیا اور پیسے لے لیے۔

حامد نے دست پناہ کندھے پر رکھ لیا، گویا بندوق ہے۔ اور شان سے اکڑتا ہوا اپنے رفیقوں کے پاس آیا۔

محسن نے ہنستے ہوئے کہا۔ " یہ دست پناہ لایا ہے۔ احمق اس کا کیا کرے گا؟"

حامد نے دست پناہ کو زمین پر پٹک کر کہا۔ "ذرا اپنا بھشتی زمین پر گرا دو۔ ساری پسلیاں چور چور ہو جائیں گی بچا کی۔"

محمود۔ "تو یہ دست پناہ کوئی کھلونا ہے؟"

حامد۔ "کھلونا کیوں نہیں ہے۔ ابھی کندھے پر رکھا بندوق ہو گیا۔ ہاتھ میں لے لیا فقیر کا چمٹا ہو گیا۔ چاہوں تو اس سے تمھاری ناک پکڑ لوں۔ ایک چمٹا دوں تو تم لوگوں کے سارے کھلونوں کی جان نکل جائے۔ تمھارے کھلونے کتنا ہی زور لگائیں اس کا بال بیکا نہیں کر سکتے۔ میرا بہادر شیر ہے یہ دست پناہ!"

سمیع متاثر ہو کر بولا۔ "میری خنجری سے بدلو گے۔ دو آنے کی ہے۔"

حامد نے خنجری کی طرف حقارت سے دیکھ کر کہا۔ "میرا دست پناہ چاہے تو تمھاری خنجری کا پیٹ پھاڑ ڈالے۔ بس ایک چمڑے کی جھلی لگا دی۔ ڈھب ڈھب بولنے لگی۔ ذرا سا پانی لگے تو ختم ہو جائے۔ میرا بہادر دست پناہ آگ میں، پانی میں، آندھی میں، طوفان میں برابر ڈٹا کھڑا رہے گا؟"

میلہ بہت دور پیچھے چھوٹ چکا تھا۔ دس بج رہے تھے۔ گھر پہنچنے کی جلدی تھی۔ اب دست پناہ نہیں مل سکتا۔ اب کسی کے پاس پیسے بھی تو نہیں رہے۔ حامد ہے بڑا ہوشیار!

اب دو فریق ہو گئے۔ محمود، محسن اور نوری ایک طرف، حامد یک و تنہا دوسری طرف۔ سمیع غیر جانب دار ہے۔ جس کی فتح دیکھے گا اس کی طرف جائے گا۔ مناظرہ شروع ہو گیا۔ آج حامد کی زبان بڑی صفائی سے چل رہی ہے۔ اتحاد ثلاثہ اس کے جارحانہ عمل سے پریشان ہو رہا ہے۔ ثلاثہ کے پاس تعداد کی طاقت ہے۔ حامد کے پاس حق اور اخلاق۔ ایک طرف مٹی، ربڑ اور لکڑی کی چیزیں، دوسری جانب اکیلا لوہا۔ جو اس وقت اپنے کو فولاد کہہ رہا ہے۔ وہ روئیں تن ہے۔ صف شکن ہے۔ اگر کہیں شیر کی آواز کان میں آ جائے تو میاں بھشتی کے اوسان خطا ہو جائیں۔ میاں سپاہی مٹی کی بندوق چھوڑ کر بھاگیں۔ وکیل صاحب کا سارا قانون پیٹ میں سما جائے۔ چغے میں منہ چھپا کر زمین پر لیٹ جائیں۔ مگر بہادر، یہ رستم ہند لپک کر شیر کی گردن پر سوار ہو جائے گا۔ اور اس کی آنکھیں نکال لے گا۔

محسن نے ایڑی چوٹی کا زور لگا کر کہا۔ "اچھا تمھارا دست پناہ پانی تو نہیں بھر سکتا۔"

حامد نے دست پناہ کو سیدھا کر کے کہا۔ "یہ بھشتی کو ایک ڈانٹ بتائے گا، تو دوڑا ہوا پانی لا کر اس کے دروازے پر چھڑکنے لگے گا۔ جناب پھر اس سے چاہے گھڑے مٹکے اور کونڈے بھر ڈالو۔"

محسن کا ناطقہ بند ہو گیا۔ نوری نے کمک پہنچائی۔ "بچا گرفتار ہو جائیں تو عدالت میں بندھے بندھے پھریں گے۔ تب تو ہمارے وکیل صاحب ہی پیروی کریں گے بولیے جناب!"

حامد کے پاس اس وار کا دفاع اتنا آسان نہ تھا۔ دفعتاً اس نے ذرا مہلت پا جانے کے ارادے سے پوچھا۔ "اسے پکڑنے کون آئے گا؟"

محمود نے کہا۔ "یہ سپاہی بندوق والا۔"

حامد نے منہ چڑھا کر کہا۔ "یہ بے چارے اس رستم ہند کو پکڑیں گے؟ اچھا لاؤ ابھی ذرا مقابلہ ہو جائے۔ اس کی صورت دیکھتے ہی بچے کی ماں مر جائے گی۔ پکڑیں گے کیا بے چارے۔"

محسن نے تازہ دم ہو کر وار کیا۔ "تمھارے دست پناہ کا منہ روز آگ میں جلے گا۔"

حامد کے پاس جواب تیار تھا۔ "آگ میں بہادر کودتے ہیں جناب۔ تمھارے یہ وکیل اور سپاہی اور بھشتی ڈرپوک ہیں۔ سب گھر میں گھس جائیں گے۔ آگ میں کودنا وہ کام ہے، جو رستم ہی کر سکتا ہے۔"

نوری نے انتہائی جودت سے کام لیا۔ "تمھارا دست پناہ باورچی خانے میں زمین پر پڑا رہے گا۔ میرا وکیل شان سے میز کرسی لگا کر بیٹھے گا۔" اس حملہ نے مردوں میں بھی جان ڈال دی۔ سمیع بھی جیت گیا۔ "بے شک بڑے معرکے کی بات کہی۔ دست پناہ باورچی خانے میں پڑا رہے گا۔" حامد نے دھاندلی کی۔ "میرا دست پناہ باورچی خانے میں نہیں رہے گا۔ وکیل صاحب کرسی پر بیٹھیں گے تو جا کر انھیں زمین پر پٹک دے گا اور سارا قانون ان کے پیٹ میں ڈال دے گا۔"

اس جواب میں بالکل جان نہ تھی۔ بالکل بے تکی سی بات تھی۔ لیکن قانون پیٹ میں ڈالنے والی بات چھا گئی۔ ایسی چھا گئی کہ تینوں سورما منہ تکتے رہ گئے۔ حامد نے میدان جیت لیا۔ گو ثلاثہ کے پاس ابھی گیند، سیٹی اور بطے ریزرو تھے۔ مگر ان مشین گنوں کے سامنے ان پناخوں کو کون پوچھتا۔ دست پناہ رستم ہند ہے۔ اس میں کسی کو چوں و چرا کی گنجائش نہیں۔

فاتح کو مفتوحوں سے وقار اور خوشامد کا خراج ملتا ہے، وہ حامد کو ملنے لگا۔ اوروں نے تین تین آنے خرچ کیے اور کوئی کام کی چیز نہ لے سکے۔ حامد نے تین ہی پیسوں میں رنگ جما لیا۔ کھلونوں کا کیا اعتبار۔ دو ایک دن میں ٹوٹ پھوٹ جائیں گے۔ حامد کا دست پناہ تو فاتح رہے گا۔ ہمیشہ۔ صلح کی شرطیں طے ہونے لگیں۔

محسن نے کہا۔ "ذرا اپنا چمٹا دو۔ ہم بھی دیکھیں۔ تم چاہو تو ہمارا وکیل دیکھو۔" حامد کو اس میں کوئی اعتراض نہیں ہے۔ وہ فیاض طبع فاتح ہے۔ دست پناہ باری باری سے محسن، محمود، نور اور سمیع سب کے ہاتھوں میں گیا۔ اور ان

کے کھلونے باری باری سے حامد کے ہاتھ میں آئے۔ کتنے خوبصورت کھلونے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے بولا ہی چاہتے ہیں۔ مگر ان کھلونوں کے لیے انھیں دعا کون دے گا؟ کون ان کھلونوں کو دیکھ کر اتنا خوش ہوگا، جتنا اماں جان دست پناہ کو دیکھ کر ہوں گی۔ اسے اپنے طرزِ عمل پر مطلق پچھتاوا نہیں ہے۔ پھر اب تو دست پناہ رستم ہے اور سب کھلونوں کا بادشاہ۔ راستے میں محمود نے ایک پیسے کی ککڑیاں لیں۔ اس میں حامد کو بھی خراج ملا۔ حالانکہ وہ انکار کرتا رہا۔ محسن اور سمیع نے ایک ایک پیسے کے فالسے لیے۔ حامد کو بھی خراج ملا۔ یہ سب رستم ہند کی برکت تھی۔

(3)

گیارہ بجے گاؤں میں چہل پہل ہوگئی، میلے والے آگئے۔ محسن کی چھوٹی بہن نے دوڑ کر بھشتی اس کے ہاتھ سے چھین لیا۔ اور مارے خوشی کے جو اچھلی تو میاں بھشتی نیچے آرہے۔ اور عالمِ جاودانی کو سدھارے۔ اس پر بھائی بہن میں مار پیٹ ہوئی۔ دونوں خوب روئے۔ ان کی اماں جان یہ کہرام سن کر اور بگڑیں، دونوں کو اوپر سے دو دو چانٹے رسید کیے۔ میاں نوری کے وکیل کا حشر اس سے بھی بدتر ہوا۔ وکیل زمین پر یا طاق پر تو نہیں بیٹھ سکتا۔ اس کی پوزیشن کا لحاظ تو کرنا ہی ہوگا۔ دیوار میں دو کھونٹیاں گاڑی گئیں۔ ان پر چیڑ کا ایک پرانا پٹرا رکھا گیا۔ پٹرے پر سرخ رنگ کا ایک چیتھڑا بچھا دیا گیا۔ جو بمنزلہ قالین کے تھا۔ وکیل صاحب عالم بالا پر جلوہ افروز ہوئے۔ یہیں سے قانونی بحث کریں گے۔ نوری ایک پنکھا لے کر جھلنے لگا۔ معلوم نہیں پنکھے کی ہوا سے یا پنکھے کی چوٹ سے وکیل صاحب عالمِ بالا سے دنیائے فانی میں آرہے۔ اور ان کے جسدِ خاکی کے پرزے ہوگئے۔ پھر بڑے زور شور کا ماتم ہوا اور وکیل صاحب کی میت پارسی دستور کے مطابق گھورے پر پھینک دی گئی۔ تاکہ بے کار نہ جا کر زاغ و زغن کے کام آجائے۔

اب رہے میاں محمود کے سپاہی۔ محترم اور ذی رعب ہستی ہے۔ اپنے پیروں چلنے کی ذلت اسے گوارا نہیں۔ محمود نے اپنا بکری کا بچہ پکڑا اور اس پر سپاہی کو سوار کیا۔ محمود کی بہن ایک ہاتھ سے سپاہی کو پکڑے ہوئے تھی۔ اور محمود بکری کے بچے کا کان پکڑ کر اسے دروازے پر چلا رہا تھا۔ اور اس کے دونوں بھائی سپاہی کی طرف سے ''چھونے والے جاگتے لہو'' [سونے والے جاگتے رہو] پکارتے چلتے تھے۔ معلوم نہیں کیا ہوا۔ میاں سپاہی اپنے گھوڑے کی پیٹھ سے گر پڑے۔ اور اپنی بندوق لیے زمین پر آرہے۔ ایک ٹانگ مضروب ہو گئی۔ مگر کوئی مضائقہ نہیں، محمود ہوشیار ڈاکٹر ہے۔ ڈاکٹر نگم اور بھاٹیا اس کی شاگردی کر سکتے ہیں۔ اور یہ ٹوٹی ٹانگ کو آناً فاناً میں جوڑ دے گا۔ صرف گولر کا دودھ چاہیے۔ گولر کا دودھ آتا ہے۔ ٹانگ جوڑی جاتی ہے۔ لیکن جوں ہی کھڑا ہوتا ہے ٹانگ پھر الگ ہو جاتی ہے۔ عمل جراحی ناکام ہو جاتا ہے۔ تب محمود اس کی دوسری ٹانگ بھی توڑ دیتا ہے۔ اب وہ آرام سے ایک جگہ بیٹھ سکتا ہے۔ ایک ٹانگ سے تو نہ چل سکتا تھا، نہ بیٹھ سکتا تھا۔ اب وہ گوشے میں بیٹھ کر ٹٹی کی آڑ میں شکار کھیلے گا۔

اب میاں حامد کا قصہ سنیے۔ امینہ اس کی آواز سنتے ہی دوڑی۔ اور اسے گود میں اٹھا کر پیار کرنے لگی۔ دفعتاً اس کے ہاتھ میں چمٹا دیکھ کر وہ چونک پڑی۔

''یہ دست پناہ کہاں تھا بیٹا۔''

''میں نے مول لیا ہے تین پیسے میں۔''

امینہ نے چھاتی پیٹ لی۔ ''یہ کیسا بے سمجھ لڑکا ہے کہ دوپہر ہوئی نہ کچھ کھایا نہ پیا۔ لایا کیا، یہ دست پناہ۔ سارے میلے میں تجھے اور کوئی چیز ہی نہ ملی۔''

حامد نے خطاوارانہ انداز سے کہا۔ ''تمھاری انگلیاں توے سے جل جاتی تھیں کہ نہیں۔''

امینہ کا غصہ فوراً شفقت میں تبدیل ہو گیا اور شفقت بھی وہ نہیں، جو پُر بیان ہوتی ہے اور اپنی تاثیر لفظوں میں منتشر کر دیتی ہے۔ یہ بے زبان شفقت تھی، درد، التجا میں ڈوبی ہوئی۔ اُف! کتنی نفس کشی ہے۔ کتنی جاں سوزی ہے۔ غریب نے اپنے طفلانہ اشتیاق کو روکنے کے لیے کتنا ضبط کیا ہوگا۔ جب دوسرے لڑکے کھلونے لے رہے ہوں گے۔ مٹھائیاں کھا رہے ہوں گے۔ اس کا دل کتنا لہراتا ہوگا۔ اتنا ضبط اس سے ہوا کیوں کر! اپنی بوڑھی اماں کی یاد اسے وہاں بھی رہی۔ میرا لال میری کتنی فکر رکھتا ہے۔ اس کے دل میں ایک ایسا علوی جذبہ پیدا ہوا کہ اس کے ہاتھ میں دنیا کی بادشاہت آجائے۔ اور وہ اسے حامد کے اوپر نثار کر دے۔ اور تب ایک بڑی دلچسپ بات ہوئی۔ بڑھیا امینہ ننھی سی امینہ بن گئی۔ وہ رونے لگی۔ دامن پھیلا کر حامد کو دعائیں دیتی جاتی تھی۔ اور آنکھوں سے آنسو کی بڑی بڑی بوندیں گراتی جاتی تھی۔ حامد اس کا راز کیا سمجھتا۔

(یہ افسانہ پہلی بار دلی کے اردو رسالہ ''عصمت'' کے 1933 کے سالگرہ نمبر میں شائع ہوا۔ افسانوی مجموعہ ''دودھ کی قیمت'' میں شامل ہے۔ ہندی میں یہ الٰہ آباد کے ماہنامہ ''چاند'' کے اگست 1933 کے شمارے میں شامل ہے۔ یہ ''مان سرودر'' جلد۔ 1 میں شائع ہوا ہے۔)

□□□

اردو خبرنامہ

حکیم عبدالحمید کی شخصیت اور خدمات پر مذاکرہ

● نئی دہلی، 17 ستمبر۔ حکیم عبدالحمید کی شخصیت اور کارناموں پر منعقد ایک سیمینار کی صدارت کرتے ہوئے سابق وزیر اعظم جناب اندر کمار گجرال نے کہا کہ حکیم عبدالحمید نے سرسید کے بعد یونیورسٹی کی صورت میں اتنا بڑا ادارہ قائم کر کے جو کارنامہ انجام دیا ہے اس کی مثال مشکل سے ہی ملے گی۔ جناب گجرال نے کہا کہ حکیم صاحب کے یہاں انکساری بہت تھی، اگر ان کے کسی کام پر کوئی مبارکباد دیتا تو وہ دوسری بات کرنے لگتے۔

قبل ازیں ہریانہ کے گورنر جناب اخلاق الرحمٰن قدوائی نے سیمینار کا افتتاح کرتے ہوئے کہا کہ حکیم عبدالحمید کی زندگی سادگی اور انکساری کی مثال تھی۔ انھوں نے اپنے ذاتی تعلق کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ میرا حکیم صاحب سے تعلق کیمیکل ریسرچ کا تھا۔ وہ طب یونانی پر ریسرچ کرتے تھے اور میں کیمیکل ریسرچ پر، اور اس تعلق سے ہم ملتے رہتے تھے۔ انھوں نے حکیم اجمل خاں کے خواب کو پورا کر دکھایا اور یونانی طب پر تغلق آباد میں ریسرچ انسٹی ٹیوٹ بنایا، جسے یونیورسٹی کا درجہ دلایا۔ حکیم عبدالحمید کی زندگی کی سادگی اور اعلیٰ خیال کی مثال نہیں ملتی اور اس کی ہمیشہ قدر کی جائے گی۔

خواجہ حسن ثانی نظامی صاحب نے اپنی استقبالیہ تقریر میں حکیم صاحب کی ادبی خدمات کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ حکیم صاحب نے نہ صرف غالب اکیڈمی قائم کر کے ادب کی خدمت کی بلکہ انھوں نے غالب اور ذوق کے مزارات کی تعمیر میں بھی حصہ لیا۔

غالب اکیڈمی کے سکریٹری ڈاکٹر عقیل احمد نے کہا کہ حکیم صاحب غالب کے دیوان کو صدا بند (Record) کرنا چاہتے تھے تاکہ اس سے ہر زبان والے فائدہ اٹھا سکیں۔ ہمدرد دواخانے کے چیف متولی جناب عبدالمعید اور سینئر متولی جناب حماد احمد نے مہمانان کا استقبال کیا۔

دوسرے روز چار اجلاس منعقد ہوئے جن میں مختلف دانشوروں نے حکیم عبدالحمید کی شخصیت اور ان کی خدمات پر روشنی ڈالی۔ پروفیسر شارب ردولوی نے اپنا مقالہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ حکیم عبدالحمید روشن خیال اور غور و فکر کرنے والے انسان تھے۔ ایسی عظیم شخصیت کے نام پر ایک یونیورسٹی قائم کی جانی چاہیے اور ایوارڈ کا اہتمام کرنا چاہیے۔ حکیم سید ظل الرحمٰن نے کہا کہ حکیم صاحب تعمیری فکر کے مالک تھے اور ان کے کام کا انداز نہایت ہی منظم اور سائنٹفک تھا۔

پروفیسر محمد حسن نے حکیم عبدالحمید کی شخصیت اور ان کی خدمات پر گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ حکیم صاحب ایک مستقل ادارہ تھے۔ حکیم صاحب کی ذات ایک نہیں بلکہ کئی انجمنوں پر مبنی تھی۔ پروفیسر قمر رئیس نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ حکیم عبدالحمید اپنے کارناموں سے لیجنڈ بن گئے یعنی وہ نہ جانے کتنے لوگوں کے دلوں میں گھر کر گئے تھے۔ ہمدرد کا ذکر کرتے ہوئے پروفیسر قمر رئیس نے کہا کہ یہ اتنی گراں قدر خدمت ہے جس سے غریب سے غریب عوام مستفید ہو رہے ہیں۔

دوسرے اجلاس میں اپنا مقالہ پیش کرتے ہوئے فیروز بخت احمد نے کہا کہ تقسیم کے بعد جب ملک کی کشتی ڈوبنے والی تھی تب اسے حکیم عبدالحمید نے بچایا۔ ڈاکٹر عابد رضا بیدار نے کہا کہ حکیم صاحب نے اردو اور ہندی کو آسان تر بنانے کے لیے ہندوستانی کی تحریک شروع کی اور اسے اولیت دیتے ہوئے اس پر تحقیقی کام کیا۔ پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی اور ڈاکٹر ریاض عمر نے بھی مقالے پیش کیے۔ تیسرے اجلاس میں پروفیسر شمیم حنفی نے کہا کہ حکیم صاحب نے وقت کے ایک ایک لمحہ سے کام لیا۔ حکیم شجاع الدین حسین نے کہا کہ یہ وہ امیر تھا جس کے سینے میں غریب کا دل دھڑکتا تھا۔ پروفیسر عبدالحیٔ فاروقی، ڈاکٹر سید عبدالباری، پروفیسر عبدالحق، گلزار دہلوی، ڈاکٹر عقیل احمد اور ڈاکٹر سید فاروق نے بھی جلسے میں اظہار خیال کیا اور صدارتی تقریر ممتاز افسانہ نگار جوگیندر پال نے کی۔ متین امروہوی نے منظوم خراج عقیدت پیش کیا۔ نظامت بالترتیب سہیل انجم، قمرالحسن، ممتاز عالم اور ڈاکٹر فیروز عالم نے کی۔ **(قومی آواز، دہلی)**

اردو یونیورسٹی میں ''سینٹر فار پروفیشنل ڈیولپمنٹ آف اردو میڈیم ٹیچرس'' کا سنگ بنیاد

● حیدرآباد، 4 ستمبر۔ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی پورے ملک میں اردو زبان و تعلیم کے فروغ میں نمایاں کردار ادا کر رہی ہے۔ اس میں دیگر علوم و فنون کی تعلیم کے ساتھ ساتھ طب اور فارمیسی کے کورس بھی شروع کرنے کی ضرورت ہے۔'' ان خیالات کا اظہار مرکزی وزیر مملکت برائے فروغ انسانی وسائل جناب محمد علی اشرف فاطمی نے مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کیمپس، حیدرآباد میں قائم کیے جانے والے ''سینٹر فار پروفیشنل ڈیولپمنٹ آف اردو میڈیم ٹیچرس'' کی عمارت کا سنگ بنیاد رکھنے کے بعد بحیثیت مہمان خصوصی اپنے خطاب کے دوران کیا۔ وائس چانسلر پروفیسر اے ایم پٹھان نے اس

تقریب کی صدارت کی جب کہ حیدر آباد کے رکن پارلیمان بیرسٹر اسد الدین اویسی، جوائنٹ سکریٹری وزارت فروغ انسانی وسائل جناب سنیل کمار، سکریٹری یونیورسٹی گرانٹس کمیشن ڈاکٹر ٹی آر کیم اور پروفیسر کے راما موورتی نائیڈو ممبر یونیورسٹی گرانٹس کمیشن بھی بحیثیت مہمانانِ اعزازی اس تقریب میں موجود تھے۔ جناب محمد علی اشرف فاطمی نے سلسلۂ تقریر جاری رکھتے ہوئے کہا کہ ملک بھر کے اردو اساتذہ کو عصری تربیت کی فراہمی کے مقصد سے مرکزی وزیر فروغ انسانی وسائل جناب ارجن سنگھ کی جانب سے تین جامعات کا اس طرح کے مراکز کے قیام کے لیے انتخاب کیا گیا ہے۔ ان میں جامعہ ملیہ اسلامیہ اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ساتھ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی شامل ہے۔ اردو یونیورسٹی پورے ملک میں اپنے اسٹڈی اور ریجنل سینٹروں کے ذریعے اردو ذریعۂ تعلیم کو گھر گھر عام کرنے کے مشن کو بڑی ہی کامیابی کے ساتھ پورا کر رہی ہے۔

جناب فاطمی نے اس موقعے پر پورے ملک میں کیندریہ ودیالیہ کی طرز پر قائم کیے جانے والے اسکولوں کا ذکر کرتے ہوئے سب سے پہلے حیدر آباد اور دربھنگہ (بہار) میں اسی تعلیمی سال سے ان اسکولوں کے قیام کا اعلان کیا۔ انھوں نے کہا کہ یہ اسکول ان اضلاع میں قائم کیے جائیں گے جہاں اردو بولنے والوں کی آبادی دس فیصد ہے۔ جناب اسد الدین اویسی نے وزارت فروغ انسانی وسائل کی جانب سے تعلیمی مسائل کی عاجلانہ یکسوئی اور عمل آوری کے لیے کیے جانے والے اقدامات کی ستائش کرتے ہوئے مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کی کارکردگی کی ستائش کی۔ انھوں نے کہا کہ انتہائی قلیل مدت میں اردو یونیورسٹی نے ملک گیر سطح پر اردو زبان اور اردو ذریعہ تعلیم کے فروغ کے لیے ٹھوس اقدامات کیے ہیں۔ پروفیسر اے۔ ایم۔ پٹھان نے اپنی صدارتی تقریر میں یونیورسٹی کے گیارھویں پنج سالہ منصوبے میں یونانی اور فارمیسی کورسوں کے آغاز کے لیے نمائندگی کی یقین دہانی کرائی۔ یونیورسٹی کی جانب سے مختلف مراکز پر ان کورسوں کو متعارف کروایا جائے گا۔ انھوں نے کہا کہ اردو میڈیم اساتذہ کی تربیت کے لیے قائم کردہ اس سینٹر کو ملک کے مختلف مراکز تک توسیع دینے کے ساتھ ساتھ اس سینٹر میں اردو اساتذہ کی تربیت کے لیے تمام عصری سہولتوں سے استفادہ کے لیے کوئی کسر نہیں چھوڑی جائے گی۔ ابتدا میں جناب فاروق احمد رجسٹرار یونیورسٹی نے خیر مقدم کیا جب کہ ڈاکٹر کے آر اقبال احمد، ڈائرکٹر نظامت فاصلاتی تعلیم نے یونیورسٹی کی تعلیمی و تعمیری سرگرمیوں کی تفصیلی رپورٹ پیش کی۔ انچارج شعبۂ تعلقات عامہ ڈاکٹر شجاعت علی راشد نے نظامت کے فرائض انجام دیے جب کہ کنٹرولر امتحانات پروفیسر ایس اے وہاب قیصر کے کلمات تشکر پر اس تقریب کا اختتام عمل میں آیا۔

(ڈاک سے)

ریسرچ اسکالر سیمینار

● نئی دہلی، 19 ستمبر۔ ''غالب کے سوانح نگار'' کے موضوع پر غالب انسٹی ٹیوٹ کی جانب سے منعقد ہونے والے ریسرچ اسکالر سیمینار کا افتتاح کرتے ہوئے پروفیسر محمد حسن نے کہا کہ غالب کا جن چیزوں سے بھی رشتہ رہا ہے اس پر ہمیں کام کرنے کی ضرورت ہے۔ انھوں نے کہا کہ ہمیں غالب کے فکر وفن کے اُن پہلوؤں پر بھی غور کرنا چاہیے جو ہماری تحقیق وتنقید کے دائرے میں اب تک نہیں آسکے۔

اس سے قبل غالب انسٹی ٹیوٹ کے سکریٹری پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے اپنی استقبالیہ تقریر میں کہا کہ اس سیمینار کا مقصد یہ ہے کہ ہم نوجوان اسکالروں کو یہ موقع فراہم کرتے ہیں کہ وہ تحقیق وتنقید کے نئے گوشوں کی تلاش کریں۔ اس موقع پر پروفیسر شمیم حنفی نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ ریسرچ اسکالر سیمینار اس اعتبار سے سب سے اہم ہے کہ اس سیمینار میں طلبہ بڑی محنت ومشقت اور تحقیق وجستجو کے ساتھ مقالات لکھتے ہیں۔ انھوں نے مزید کہا کہ غالب کے عہد کی طرح ان کی اپنی ہستی بھی غیر معمولی تضادات سے بھری ہوئی تھی۔ غالب نے خود بھی اپنی خامیوں کا ذکر کیا ہے اور کہیں ان کی پردہ پوشی نہیں کی۔ ان کی کمزوریاں عام انسانوں کی کمزوریاں تھیں۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر جناب شاہد ماہلی نے بھی جلسے میں اظہار خیال کیا۔

افتتاحی اجلاس کے بعد اس سیمینار کے تین اجلاس ہوئے جس میں بحیثیت صدور ڈاکٹر خلیق انجم، پروفیسر شریف حسین قاسمی، ڈاکٹر عراق رضا زیدی، پروفیسر سید امیر حسن عابدی، پروفیسر شاہد حسین، پروفیسر ابن کنول اور ڈاکٹر اختر مہدی نے تمام مقالات پر علمی گفتگو کی۔ آفتاب عالم، غلام عباس، اشوک کمار، عفت ذکیہ، جاوید اقبال، فرح ادیبہ، عمر رضا، نشاں خاتون اور حفظ الرحمٰن نے مقالات پیش کیے۔ ڈاکٹر رضا حیدر، ممتاز عالم اور جاوید رحمانی نے نظامت کی۔ (ڈاک سے)

''امیر خسرو۔۔۔ ہندوستان کا عظیم قومی فارسی شاعر'' سہ روزہ سیمینار

● ممبئی۔ ممبئی یونیورسٹی کے ڈیڑھ سو سالہ جشن یوم تاسیس کے موقعے پر شعبۂ فارسی ممبئی یونیورسٹی نے ''امیر خسرو۔۔۔ ہندوستان کا عظیم قومی فارسی شاعر'' کے موضوع پر ایک سہ روزہ عالمی سیمینار کا انعقاد کیا۔ صدر شعبۂ فارسی، ڈاکٹر مہر النسا خان نے اپنی استقبالیہ تقریر میں امیر خسرو کی ہمہ گیر اور یگانۂ روزگار شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی۔

مہمان خصوصی جناب کاشانی نژاد، کونسل جنرل آف ایران نے دور

حاضر میں پیامِ خسروؔ کی اہمیت و افادیت کو اجاگر کیا۔ مہمانِ اعزازی جناب منور پیر بھائی، چیئرمین حاجی غلام محمد اعظم ایجوکیشن ٹرسٹ پونے، نے امیر خسرو کی فارسی شاعری میں ہندوستانی تہذیب و ثقافت کی عکاسی کے موضوع پر گفتگو کی۔ پروفیسر عبدالودود اظہر، جواہر لال نہرو یونیورسٹی، دہلی نے کلیدی خطبہ پیش کیا۔

سیمینار میں ملک کی مختلف یونیورسٹیوں مثلاً کولکاتہ یونیورسٹی، وشو بھارتی یونیورسٹی (شانتی نکیتن، مغربی بنگال) علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی، جواہر لال نہرو یونیورسٹی، دہلی، عثمانیہ یونیورسٹی، حیدر آباد اور ناگپور کے اساتذہ، دانشوروں اور محققین نے مقالے پیش کیے۔

اختتامی اجلاس میں صدر جلسہ جناب منور پیر بھائی، مہمان خصوصی جناب سمیع خطیب، صدر انجمنِ اسلام ممبئی، مہمان اعزازی جناب محمد رضا مرزائی ڈائرکٹر ایران کلچر ہاؤس، ممبئی اور جناب صالح محمد خان جنرل سکریٹری یونانی میڈیکل کالج، پونے تھے۔ آخر میں ڈاکٹر مہرالنسا خان نے شکریہ ادا کیا۔
(ڈاک سے)

''آبادی، آلودگی اور افلاس'' پر خطبہ

● نئی دہلی، 21 ستمبر۔ ''تین الف یعنی'' آبادی، آلودگی اور افلاس'' کو اگر بوتل میں قید کرلیا جائے تو سمجھ لیجیے کہ جن قابو میں آ گیا ہے۔ آبادی ایک بہت بڑا مسئلہ ہے، بڑھتی ہوئی آبادی ایک پر نہیں بلکہ لاکھوں زندگیوں پر اثر انداز ہوتی ہے۔ 1960 میں پوری دنیا کی آبادی تین ارب تھی۔ 1975 میں یہ چار ارب ہو گئی۔ 1982 میں پانچ ارب ہو گئی۔ ہندوستان کی آبادی 1936 میں 36 کروڑ تھی جو 2001 میں تین گنا بڑھ کر ایک ارب دو کروڑ ہو گئی۔ اور اس وقت 2006 میں ایک ارب گیارہ کروڑ تک آ پہنچی ہے۔ اندازے کے مطابق یہ آبادی 2020 میں ایک ارب چالیس کروڑ پہنچ سکتی ہے۔'' ان خیالات کا اظہار معروف جغرافیہ داں پروفیسر محمد شفیع (پروفیسر ایمرٹس شعبۂ جغرافیہ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ) نے شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی کے زیر اہتمام نظام اردو خطبات سیریز کے تحت'' آبادی، آلودگی اور افلاس'' کے موضوع پر اپنا تاریخی خطبہ پیش کرتے ہوئے کیا۔ قبل ازیں پروفیسر محمد شفیع، پروفیسر گوپی چند نارنگ، پروفیسر قمر رئیس کے ہاتھوں پروفیسر ابن کنول کی مرتب کردہ شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی کی کتاب ''تحقیق و تدوین'' کا اجرا عمل میں آیا۔ پروفیسر محمد شفیع کا خطبہ تین حصوں پر مشتمل تھا۔ جس کا انھوں نے سلسلے وار احاطہ کرتے ہوئے تفصیلی خطاب کیا۔ آلودگی پر گفتگو کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ اس پر قابو پانے کے لیے ایک مستحکم سماجی نظام کا ہونا لازمی ہے۔ پانی اور ہوا جیسی زندگی کی ناگزیر چیزوں کو آلودگی سے بچانا بے حد ضروری ہے۔ افلاس پر گفتگو کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ یہ بڑا ہی سنگین معاملہ ہے۔ جب پیٹ میں روٹی نہیں ہوتی تو اس وقت نہ ذرّے ہیرے معلوم ہوتے ہیں اور نہ شبنم موتی۔ کوئی ملک اسی وقت ترقی کرتا ہے جب سماجی انصاف قائم ہوتا ہے۔

پروگرام کا افتتاح پروفیسر قمر رئیس نے کیا۔ صدارتی تقریر میں ساہتیہ اکادمی کے صدر پروفیسر گوپی چند نارنگ نے کہا کہ کوئی زبان محض شعر و ادب کے ذریعے باقی نہیں رہ سکتی کہ جب تک اسے دیگر علوم سے نہ جوڑا جائے۔

پروگرام کے آغاز میں صدر شعبۂ اردو پروفیسر ابن کنول نے استقبالیہ تقریر کرتے ہوئے پروفیسر محمد شفیع کی زندگی، ان کے کارناموں اور نظام اردو خطبات کی تاریخ پر روشنی ڈالی۔ آخر میں پروفیسر صادق نے تمام مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔ نظامت ڈاکٹر ارتضیٰ کریم نے کی۔ **(ڈاک سے)**

طنز و مزاح پر مذاکرہ

● نئی دہلی، 20 ستمبر۔ ساہتیہ اکادمی کی جانب سے اردو طنز و مزاح پر منعقدہ جلسے میں پروفیسر گوپی چند نارنگ، صدر ساہتیہ اکادمی نے جلسے کا افتتاح کرتے ہوئے کہا کہ طنز و مزاح ادب کا ضروری حصہ ہے۔ اس کے بغیر کسی زبان کے ادب کا تصور ہی ممکن نہیں۔ معاشرے کی بوالعجبیوں پر طنز کے ذریعے ہی کارگروار کیا جا سکتا ہے۔ معاشرے کی اصلاح کے لیے کوئی دوسرا ادبی حربہ اتنا کارگر نہیں جتنا طنز و مزاح۔

سیمینار کے پہلے اجلاس کی صدارت معروف طنز و مزاح نگار نصرت ظہیر نے، دوسرے اجلاس کی صدارت مشہور ادیبہ صغرا مہدی نے اور تیسرے اجلاس کی صدارت ممتاز شاعر ساغر خیامی نے کی۔ پہلے دو اجلاس نثر نگاروں کی مزاحیہ تخلیقات پر مشتمل تھے۔ ان میں اکرام الحق، منظور عثمانی، کوثر رضوی، ڈاکٹر خالد محمود اور سید ضمیر حسن دہلوی نے اپنے مزاحیہ مضامین، خاکے اور انشائیے پیش کیے۔ آخری اجلاس میں طنز و مزاح کے مشہور شعرا رضوان اللہ، اسرار جامعی، پاپولر میرٹھی اور ساغر خیامی نے اپنے کلام سے محظوظ کیا۔
(راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

ریلوے پبلک انفارمیشن افسر کا آرٹی آئی ایکٹ کے تحت تین سال پرانی فائل دکھانے سے انکار

● الٰہ آباد۔ نارتھ سینٹرل ریلوے، صدر دفتر الٰہ آباد کے اسسٹنٹ پبلک انفارمیشن افسر نے اتر پردیش اردو ڈیولپمنٹ آرگنائزیشن کے صدر محمد اختر چوڑی والا کی درخواست پر رائٹ ٹو انفارمیشن ایکٹ کے تحت اطلاع دی ہے کہ تنظیم کی درخواست مورخہ 01-09-2002 کی فائل بہت پرانی ہو گئی ہے، اور تقریباً تین سال بعد اس کے ریکارڈ کا معائنہ کرانا ممکن نہیں، کیونکہ ایسے ریکارڈ زیادہ دن نہیں رکھے جاتے۔ لہٰذا تنظیم نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ وہ

اس فیصلے کے خلاف مرکزی چیف انفارمیشن کمشنر کے یہاں اپیل کرے گی۔

اسسٹنٹ پبلک انفارمیشن افسر نے تنظیم کی درخواست کے جواب میں صرف یہ لکھا ہے کہ ''کرایہ فہرست، نیم پلیٹ، ٹائم ٹیبل وغیرہ تمام مسافر سے متعلق جانکاری جگہ کی کمی کی وجہ سے ہندی اور انگریزی میں مہیا ہے۔ اسٹیشنوں کا نام، گاڑی نمبر اور کرایہ فہرست میں صرف ''لیٹر اور نمبر'' ہیں، جس سے مسافروں کو پریشانی نہیں ہوتی ہے۔ پھر بھی کوشش کی جارہی ہے کہ اردو زبان میں بھی لکھا جائے۔ جب کہ اس درخواست میں پانچ مطالبات کیے گئے ہیں۔

1. مرکزی حکومت کی لینگویج پالیسی آرڈر نمبر 220 کے مطابق ریلوے ریزرویشن اپلیکیشن فارم اور دیگر فارم اتر پردیش کی علاقائی زبان اردو میں بھی چھپوا کر عوام کو مہیا کرایا جائے اور ریزرویشن کاؤنٹر پر اردو تعلیم یافتہ ملازمین/اردو مترجمین تعینات کیے جائیں یا ریلوے گروپ 'سی' کے ملازمین کی تقرری کی تعلیمی لیاقت میں اردو کا علم انٹرمیڈیٹ تک لازمی کیا جائے۔
2. ''ریلویز ایکٹ۔1989'' کی دفعہ (1)49 اور مرکزی حکومت کی لینگویج پالیسی آرڈر 212 کے مطابق اتر پردیش میں موجود تمام ریلوے اسٹیشنوں پر کرایہ فہرست اور گاڑیوں کی آمد و رفت کے اوقات یعنی ٹائم ٹیبل اور نیم پلیٹوں اور نوٹس بورڈوں کو اتر پردیش کی علاقائی زبان'' اردو'' میں بھی لکھوایا جائے۔
3. ''ریلویز ایکٹ 1989'' کی دفعہ (2)49 کے مطابق اتر پردیش کے تمام ریلوے اسٹیشنوں پر ہندی اور اردو دونوں سرکاری/علاقائی زبانوں میں چھپے ٹائم ٹیبل کو اسٹیشن ماسٹر کے دفاتر میں فراہم کرایا جائے۔
4. اتر پردیش میں جہاں جہاں بھی ریلوے اسٹیشنوں کے نام اردو میں غلط اور چھوٹی سی جگہ میں لکھے ہوئے ہیں، انھیں مرکزی حکومت کی لینگویج پالیسی آرڈر۔212 کے مطابق صحیح صحیح (خوش خط) اور مساوی جگہ میں لکھوایا جائے۔
5. ''ریلویز ایکٹ 1989'' کی دفعہ۔50 کے مطابق سلیپر کلاس اور آرڈینری کلاس کا ٹکٹ اتر پردیش کی ریجنل لینگویج یعنی علاقائی زبان ''اردو'' میں بھی یعنی ذولسانی ہندی۔اردو میں چھپوا کر عوام کو مہیا کرایا جائے۔ (ڈاک سے)

اردو اساتذہ کا تربیتی کیمپ

● مظفر پور، 21 ستمبر۔ ریاستی تعلیمی منصوبہ کے تحت پارو بلاک میں اردو زبان کی تربیت کے لیے ایک 5 روزہ کیمپ منعقد کیا گیا۔ اس کیمپ میں بلاک کے سبھی سرکاری اسکولوں کے اردو اساتذہ کو اردو کے فروغ کے سلسلے میں تربیت دی گئی۔ یہ تربیتی کیمپ سینئر ٹیچر سید اسعد اور منور حسین کی نگرانی میں منعقد کیا گیا۔ اس موقع پر اردو ٹیچروں سے خطاب کرتے ہوئے محفوظ عارف نے مادری زبان کی افادیت پر روشنی ڈالتے ہوئے درس و تدریس میں جدید تکنیک اپنانے کی صلاح دی۔ جلسے میں بلاک کے بی ای او شیلندر کمار نے بھی اردو زبان کی ترویج و اشاعت کے لیے مفید مشورے دیے۔ پروگرام میں محمد زاہد حسین، محمد عزیز، عبید الرحمٰن، محمد شمس الدین، محمد زبیر عالم، محمد قیصر عالم، عبدالمنان، سراج الدین انصاری، حشمت علی، لقمان حکیم، محمد نسیم انصاری، محمد ابوطیب، محمد مختار حسین اور محمد غیاث الدین وغیرہ اساتذہ شامل تھے۔ (ڈاک سے)

مولوی محمد باقر کی یاد میں جلسہ

● مراد آباد، 19 ستمبر۔ اشفاق و بسمل میموریل سوسائٹی کے ایک جلسے میں عظیم اردو صحافی مولوی محمد باقر کی یوم شہادت کے موقع پر انھیں یاد کیا گیا۔ قاری امیر علی چوک میں منعقدہ میٹنگ کی صدارت راحت زماں خاں اور نظامت طاہر کاشی پوری نے کی۔ مقررین نے کہا کہ اردو ادب میں اپنا اہم مقام رکھنے والے مولوی محمد حسین آزاد کے والد مولوی محمد باقر کو انگریزوں کی غلامی بالکل قبول نہ تھی۔ انھوں نے ملک کی آزادی کے لیے اپنے اردو اخبار کا سہارا لیا اور 17 مئی 1857 کے شمارے میں جنگ آزادی کے حالات کی تفصیلی اشاعت کی۔ انگریزوں نے انھیں 14 ستمبر کو گرفتار کرنے کے بعد 16 ستمبر 1857 کو دہلی دروازے کے نزدیک گولی مار کر شہید کر دیا۔ جلسے میں عبدالمنان انصاری، حیدر علی، جاوید زماں خاں، محمد کمال احمد، عامر خاں، شاہد ساگر اور محمد عظیم وغیرہ نے شرکت کی۔ (ڈاک سے)

جدہ میں اردو یونیورسٹی کے امتحانی مرکز کا قیام

● حیدر آباد، 20 ستمبر۔ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی نے جدہ، سعودی عرب میں یونیورسٹی کا امتحانی مرکز قائم کرنے میں کامیابی حاصل کرلی ہے۔ اردو ذریعۂ تعلیم کے ساتھ دیار غیر میں اعلیٰ تعلیم کا حصول جدہ میں مقیم لاکھوں ہندوستانیوں کا ایک دیرینہ خواب تھا جو پروفیسر اے ایم پٹھان وائس چانسلر اردو یونیورسٹی کی فعال قیادت کے باعث شرمندہ تعبیر ہوسکا ہے۔ قونصل جنرل جدہ ڈاکٹر اوصاف سعید کی جانب سے انٹرنیشنل اردو اسکول جدہ میں 12 ستمبر کو منعقدہ ایک اجلاس عام میں مقررین نے اردو یونیورسٹی کے اس اقدام کی ستائش کی۔ اس موقع پر ڈاکٹر اوصاف سعید نے اپنے کلیدی خطبے میں مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کی جانب سے اردو ذریعۂ تعلیم کے ساتھ اعلیٰ تعلیم کی فراہمی کے لیے کیے جانے والے اقدامات کی تعریف کی۔ پروفیسر اے ایم پٹھان نے اپنے خطاب میں زندگی کے کسی بھی شعبے میں کامیابی کے

لیے تعلیم ہی کو کلید قرار دیتے ہوئے کسی بھی فرد کی شخصیت سازی کے لیے تعلیم کو ناگزیر قرار دیا۔ انھوں نے کہا کہ کسی بھی صحت مند معاشرے کی تشکیل تعلیم کے بغیر مشکل ہی نہیں ناممکن ہے۔ پروفیسر پٹھان نے مولانا آزاد یونیورسٹی کی جانب سے اردو کی ترویج و ترقی کے ساتھ ساتھ اردو ذریعۂ تعلیم سے جدید تعلیم اور اعلیٰ تعلیم کے فروغ کے لیے کی جا رہی کاوشوں کا ذکر کرتے ہوئے امید ظاہر کی کہ اردو یونیورسٹی میں روایتی اور فاصلاتی دونوں طرز کی تعلیم کے علاوہ فنی اور پیشہ ورانہ کورس بھی قومی اور بین الاقوامی سطح پر اردو ذریعۂ تعلیم کے طلبہ کے لیے ایک اہم سنگ میل ثابت ہوں گے۔ انھوں نے مزید کہا کہ بہت جلد دنیا کے دیگر حصوں میں بھی یونیورسٹی کے پروگراموں کو وسعت دی جائے گی۔ رجسٹرار جناب فاروق احمد نے یونیورسٹی کی موجودہ کارکردگی کے علاوہ مستقبل کے منصوبوں پر بھی تفصیلی روشنی ڈالی۔ ڈائرکٹر اور صدر شعبۂ نظامت فاصلاتی تعلیم ڈاکٹر کے آر اقبال احمد نے اس موقعے پر 1998 میں یونیورسٹی کے قیام کے بعد سے تا حال نظامت فاصلاتی تعلیم کی جانب سے چلائے جانے والے تعلیمی پروگراموں کی تفصیل بیان کی۔ انھوں نے جدہ میں قائم کیے جانے والے امتحانی مرکز کے بارے میں بتایا کہ اس مرکز کی جانب سے قونصل جنرل کی زیر نگرانی امتحانات کا انعقاد عمل میں لایا جائے گا جب کہ انڈین ایجوکیشن کونسل (IES) یونیورسٹی کے نظامت فاصلاتی تعلیم کے تحت چلائے جانے والے بی. اے.، بی. کام. کے علاوہ ایم. اے. اردو، ایم. اے. تاریخ اور ایم. اے. انگریزی کورسوں میں جدہ میں مقیم ہندوستانیوں کے داخلے کے لیے یونیورسٹی کے ساتھ تعاون کرے گی۔ انھوں نے کہا کہ ایسے طلبہ جنھوں نے بارھویں یا اس کے مماثل امتحان میں کامیابی حاصل نہیں کی ہے ان کے لیے یونیورسٹی 5 نومبر 2006 کو جدہ کے امتحانی مرکز پر ایک اہلیتی امتحان منعقد کرے گی جب کہ گریجویشن اور پوسٹ گریجویشن میں داخلے کے اہل طلبہ 18 نومبر تک آئی ای ایس (IES) کی جانب سے نامزد عہدیداروں جناب سلطان مظہر اور جناب سید حیدر کی معرفت بھی داخلے کی تکمیل کر سکتے ہیں جب کہ داخلہ حاصل کرنے والے تمام طلبہ کے لیے اسٹڈی میٹریل وغیرہ قونصل جنرل کے دفتر اور آئی ای ایس (IES) کی معرفت ہی طلبہ کو پہنچایا جائے گا۔

(ڈاک سے)

جگر مرادآبادی کی یاد میں جلسہ

● گونڈہ، 11 ستمبر۔ اردو غزل کو بام عروج تک پہنچانے والے شاعر علی سکندر جگر مرادآبادی کی 46ویں برسی پر جگر انٹر کالج میں ایک تقریب کا انعقاد کیا گیا جس میں مرحوم شاعر کو خراج عقیدت پیش کیا گیا۔ اس موقعے پر جگر مرادآبادی کی یاد میں ڈگری کالج قائم کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔

پرنسپل جمال محمد خاں نے کالج کی تاریخ پر روشنی ڈالی۔ نظامت ڈاکٹر بدیع الدین احمد نے کی۔ انھوں نے جگر مرادآبادی پر اپنا مقالہ بھی پیش کیا۔ اس موقعے پر کرنل گنج کے سابق چیئرمین شمیم اچھن، عمر گونڈوی، عبدالوکیل قریشی، بی ایس پی لیڈر عبدالجلیل خاں، سماج وادی لیڈر محمد آفاق وارثی نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

ایک شام رفعت سروش کے نام

● نئی دہلی، 29 ستمبر۔ انجمن ترقی پسند مصنفین، دہلی کی جانب سے رفعت سروش کے اعزاز میں ایک جلسے کا اہتمام اجے بھون میں کیا گیا۔ ہندی کی ادیبہ ڈاکٹر گیتا شرما کی صدارت میں منعقد ہونے والے اس جلسے میں رفعت سروش کا تفصیلی تعارف کراتے ہوئے شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی کے استاد ڈاکٹر ابوبکر عباد نے کہا کہ رفعت سروش کا شمار ہندستان کے عہد حاضر کے اہم شاعروں میں ہوتا ہے۔ ان کی شخصیت کثیرالجہات ہے۔ وہ بیک وقت شاعر، نثر نگار، ناول نویس، اوپیرا نگار، ڈراما نگار اور نقاد ہیں۔ انھوں نے اردو کی شعری اور نثری اصناف دونوں کو ثروت مند کیا ہے اور اوپیرا نگاری میں نمایاں مقام حاصل کیا ہے۔

اس محفل میں رفعت سروش نے انجمن ترقی پسند مصنفین سے اپنی وابستگی کا اعادہ کرتے ہوئے انجمن کی ابتدائی دور کی سرگرمیوں پر روشنی ڈالی۔ اس کے بعد انھوں نے اپنی کئی غزلوں اور نظموں سے سامعین کو نوازا۔ اس جلسے میں معروف پنجابی شاعرہ اُشا فارغ نے بھی عصری مسائل پر بہت سی نظمیں سنائیں۔ ان کے علاوہ کے پی سریواستو رند اور پنجابی شاعر راجندر آتش نے بھی اپنی غزلوں سے سامعین کو محظوظ کیا۔ جلسے کی نظامت انجمن کی جنرل سکریٹری ڈاکٹر ارجمند آرا نے کی۔ (ڈاک سے)

بھیونڈی میں ترغیبی پروگرام برائے میڈیکل اور انجینئرنگ

● بھیونڈی۔ ''بزم علم و ادب'' بھیونڈی کی جانب سے بارھویں سائنس کے اردو میڈیم طلبہ و طالبات کے لیے MHT-CET (میڈیکل اور انجینئرنگ) کی تیاری کے لیے ایک ترغیبی پروگرام 17 ستمبر کو غلام محمد مومن ویمنز کالج ہال میں منعقد کیا گیا۔ اس کی صدارت شہر کے مشہور ڈاکٹر نثار مقری نے کی۔ تقریب کے مہمان خصوصی ڈاکٹر مصدق پٹیل (سکریٹری کوکن مسلم ایجوکیشن سوسائٹی) تھے۔ پروگرام میں سیکڑوں طلبہ و طالبات سے علم کیمیا، علم طبیعات، علم حیاتیات اور علم ریاضی کے ماہرین نے خطاب کیا اور انھیں انتہائی کارآمد باتیں بتائیں۔ ماہر علم حیاتیات جناب اشفاق قادری، ماہر علم طبیعات جناب سید لیاقت، ماہر علم کیمیا جناب عبدالقیوم خاں اور ریاضی کے معلم جناب شمیم مومن نے طلبہ کو اپنی تعلیمی استعداد میں اضافہ کرنے کے گر بتائے۔

اس موقع پر جناب شفیع مقری (چیئر مین رئیس ہائی اسکول کمیٹی بھیونڈی) جناب دانیال قاضی (چیئر مین رئیس جونیئر کالج کمیٹی) اور جناب محمد رفیع انصاری نے بھی جلسے میں خطاب کیا۔ بزم علم و ادب کے نائب صدر جناب ضیاء الرحمٰن انصاری نے پروگرام کی غرض و غایت پر روشنی ڈالی۔ جناب عامر صدیقی اور جناب ساجد انصاری نے نظامت کی۔ بزم علم و ادب کے سکریٹری جناب عبدالعزیز انصاری نے شکریہ ادا کیا۔ (ڈاک سے)

انجمن اساتذۂ اردو جامعات ہند کے عہدیداران کا انتخاب

● جموں۔ انجمن اساتذۂ اردو جامعات ہند کی کل ہند کانفرنس پٹنی ٹاپ، جموں میں 11-10 ستمبر 2006 کو منعقد ہوئی جس میں ہندوستان کی مختلف دانش گاہوں کے اردو اساتذہ نے شرکت کی۔ اس کانفرنس کا افتتاح جموں یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر امیتابھ متو نے کیا۔

دو دن پر محیط مختلف اجلاسوں میں شرکا نے اردو شعبوں میں اعلیٰ تعلیم اور تحقیق کے مسائل پر غور و خوض کیا اور نصاب اور تعلیم کا معیار بہتر بنانے کی تجاویز کے علاوہ اردو کے فروغ کے لیے بہت سی تجویزیں پیش کیں اور اتفاق رائے سے انھیں منظوری دی۔

کانفرنس کے آخری اجلاس میں انجمن کے عہدیداران کا انتخاب اتفاق رائے سے عمل میں آیا۔ پروفیسر ظہور الدین انجمن کے سرپرست اعلیٰ اور پروفیسر اسلم آزاد سرپرست نامزد کیے گئے۔ پروفیسر قاضی جمال حسین بحیثیت صدر اور پروفیسر نصرت آرا چودھری اور ڈاکٹر جمشید قمر نائب صدور کے عہدوں پر منتخب ہوئے۔ جنرل سکریٹری کے عہدے پر ڈاکٹر علی جاوید کا انتخاب عمل میں آیا اور جوائنٹ سکریٹری ڈاکٹر مشتاق احمد منتخب ہوئے۔ ڈاکٹر ارجمند آرا کو خازن، اور ڈاکٹر نجمہ رحمانی کو آفس سکریٹری کی ذمے داریاں سونپی گئیں۔ ان عہدیداران کے علاوہ مختلف صوبوں میں اکادمک سرگرمیوں کو فروغ دینے کے لیے چند ریجنل سکریٹری بھی منتخب کیے گئے اور ایگزیکٹیو کو یہ اختیار دیا گیا کہ تمام صوبوں میں انجمن کی علاقائی شاخوں کو فعال بنانے کے لیے وہ سکریٹریوں کو نامزد کرے اور ان سے درخواست کرے کہ وہ اپنے اپنے صوبے میں انجمن کو تشکیل دیں۔ ریجنل سکریٹری کے طور پر ڈاکٹر مسرت فردوس (مہاراشٹر)، ڈاکٹر شہاب ملک (جموں و کشمیر، پنجاب اور ہماچل پردیش)، ڈاکٹر عائشہ سلطانہ (دہلی) اور ڈاکٹر ثروت خان (راجستھان) کا انتخاب عمل میں آیا۔ مجلس عاملہ کے اراکین میں پروفیسر نذیر ملک، ڈاکٹر مجید مضمر، ڈاکٹر مظہر احمد، ڈاکٹر خواجہ اکرام الدین، ڈاکٹر ابوبکر عباد، ڈاکٹر دیے دیو سنگھ اور ڈاکٹر ابوبکر رضوی کے اسمائے گرامی شامل ہیں۔

(ڈاک سے)

مودود صدیقی پریس ایکریڈیشن کمیٹی، دہلی کے ممبر

● نئی دہلی، 21 ستمبر۔ بزرگ اردو صحافی جناب مودود صدیقی کو دلی سرکار نے پریس ایکریڈیشن کمیٹی کا دوبارہ ممبر نامزد کیا ہے۔ یہ اطلاع دلی سرکار کے حالیہ نوٹیفکیشن میں دی گئی ہے۔ امسال اس کمیٹی میں اردو کے کل تین صحافی نامزد کیے گئے ہیں بقیہ دو صحافی جناب نصرت ظہیر (قومی آواز) اور جناب خرم رضا (صدائے وطن) ہیں۔ کمیٹی کی مدت کار دو سال ہوگی۔ اپنی پچھلی مدت کار کے دوران جناب مودود صدیقی نے اردو اخبارات کے تئیں افسر شاہی کے جانبدارانہ اور سست رویہ کو بدلنے کے لیے متعلقہ محکمہ کی توجہ دلائی اور اپنی تجاویز پیش کی تھیں جن کا مثبت نتیجہ برآمد ہوا ہے۔ (قومی آواز، دہلی)

جلسۂ تہنیت

● گلبرگہ، 24 ستمبر۔ کرناٹک اردو اکادمی بنگلور کے انعام یافتگان جناب سید مجیب الرحمٰن اور ڈاکٹر جلیل تنویر کے اعزاز میں خواجہ بندہ نواز ایوان اردو میں جلسۂ تہنیت زیر صدارت جناب ولی احمد نائب صدر انجمن منعقد ہوا۔ جناب امجد جاوید نائب صدر انجمن نے خیر مقدم کیا۔ میر شاہ نواز شاہین، شریک معتمد انجمن نے ''جلیل تنویر— بہ حیثیت نثر نگار'' مضمون پیش کیا۔ پروفیسر محمد ہاشم علی نے سید مجیب الرحمٰن کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ اس موقعے پر ڈاکٹر جلیل تنویر اور سید مجیب الرحمٰن نے بھی اظہار خیال کیا۔ آخر میں جناب وہاب عندلیب سابق چیئر مین کرناٹک اردو اکادمی نے حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔ خواجہ پاشا انعامدار نے جلسے کی نظامت کی۔

(ڈاک سے)

ڈاکٹر رفیع الدین ناصر کو بیربل ساہنی ایوارڈ

● لکھنؤ، 12 اگست۔ بیربل ساہنی فاؤنڈیشن لکھنؤ کی جانب سے علم نباتیات میں نمایاں تحقیقی کام انجام دینے والے ماہر نباتیات کو دیا جانے والا ایوارڈ امسال ایتھنو باٹنی میں گراں قدر خدمات انجام دینے کے لیے اورنگ آباد کالج فار ویمن اورنگ آباد کے شعبۂ نباتیات کے لیکچرر ڈاکٹر رفیع الدین ناصر کو دیا گیا ہے۔ یہ اعزاز انھیں ڈاکٹر بابا صاحب امبیڈکر مرہٹواڑہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر ناگناتھ کوتا پلے کے ہاتھوں نباتیات کی قومی کانفرنس میں دیا گیا جس میں پورے ملک کے ماہر نباتیات کثیر تعداد میں موجود تھے۔ ڈاکٹر رفیع الدین ناصر 12 سال سے اورنگ آباد ضلع کی ایتھنو باٹنی پر تحقیق کر رہے ہیں جس میں انھوں نے انسان اور حیوان کے علاج میں استعمال کیے جانے والے تقریباً 250 نباتات کے علاوہ علاقے میں

سماجی، مذہبی اور معاشی طور سے استعمال کیے جانے والے کئی نباتات کو پیش کیا۔اس بنیاد پر انھیں 2004 میں بہترین ریسرچر (محقق) کا اعزاز بھی مل چکا ہے۔ڈاکٹر رفیع الدین ناصر اب تک 10 سائنسی کتابیں تحریر کر چکے ہیں۔
(ڈاک سے)

مختصرات

● کٹک،20 ستمبر۔بچوں میں اردو زبان کے فروغ اور ادب اطفال کو مزید مالا مال کرنے کے لیے ''ترویج'' کے مدیر جناب خاور نقیب نے اڑیسہ سے بچوں کا سہ ماہی رسالہ ''جگنو'' کا اجرا کیا ہے۔جس کے شمارۂ اول کے مشمولات میں مذہب، سائنس، کہانیاں، نظمیں، پہیلیاں، معلومات عامہ باتصویر کہانی(کومکس) دوستی کلب،ٹکٹ البم وغیرہ دلچسپ مواد شامل ہے۔

''چاچا نہرو کی یاد میں'' شائع ہونے والے اس رسالے کے پہلے شمارے کی پہلی کاپی اڑیسہ کے گورنر عزت مآب رامیشور ٹھاکر کی خدمت میں پیش کی گئی۔ اس موقعے پر جناب سید مستفیض احمد (سابق وزیر، اڑیسہ) جناب سید منظور احمد قاسمی (سابق سکریٹری اڑیسہ اردو اکادمی) اور جناب سید عطامحی الدین (سکریٹری اڑیسہ اسٹیٹ مدرسہ ایجوکیشن بورڈ) نے خاور نقیب کی ادبی وصحافتی خدمات پر روشنی ڈالی۔
(ڈاک سے)

● سیتا پور۔ سماجی تنظیم مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ اکیڈمی کی جانب سے ایک جلسے اور مشاعرے کا انعقاد کیا گیا جس میں صدر جمہوریۂ ہند سے اعزاز یافتہ معلم مست حفیظ رحمانی کو ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد صدر اتر پردیش اردو اکیڈمی اور حاجی جلال الدین انصاری صدر ندوی اکیڈمی نے شیلڈ اور شال دے کر اعزاز پیش کیا۔مشاعرے میں جن شعرائے کرام نے اپنے کلام سے محظوظ کیا ان میں ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد، مست حفیظ رحمانی، حامد بہرائچی، اشتیاق علی صبا، رضوان خان، عمر فاروقی، عرفان لکھنوی، رام پرکاش بیخود، ڈاکٹر اجمل بسوانی، منظر یٰسین، محفوظ رحمانی، شکیل ملا نوی، ڈاکٹر کفیل بسوانی، عارف محمد عارف، بدر سیتاپوری، راشد راہی بہرائچی، رفیق شادانی، خالد قیصر، مفتی خبیر ندوی کے نام شامل ہیں۔
(ڈاک سے)

● ناگپور۔ بابر شریف نے ماسٹر آف فائن آرٹس (فنون لطیفہ) فن مصوری میں کل 726 نمبرات حاصل کر کے ناگپور یونیورسٹی میں دوسرا مقام حاصل کیا ہے جب کہ پہلا مقام حاصل کرنے کے لیے انھیں صرف ایک نمبر کی ضرورت تھی۔ناگپور یونیورسٹی نے پانچ شعبوں کو ملا کر ایک شعبہ بنایا ہے جس میں رقص، ڈراما، موسیقی، پینٹنگ اور اپلائیڈ آرٹ ہے۔بابر شریف ناگپور یونیورسٹی کے اس شعبے کے واحد مسلم طالب علم ہیں۔وہ معروف شاعر شریف احمد شریف کے فرزند ہیں۔ناگپور کی علمی وادبی انجمنوں نے ان کی اس نمایاں کامیابی پر مبارکباد دی ہے۔
(ڈاک سے)

مشاعرے

● جدہ، ریاض۔ ہندوستانی قونصل خانہ، جدہ کی جانب سے 14، 15 اور 21 ستمبر کو سعودی عرب کے شہر جدہ اور ریاض میں یوم آزادی کے سلسلے میں کل ہند مشاعرے منعقد ہوئے جن کی صدارت جناب مظہر امام اور جناب مخمور سعیدی نے کی جب کہ نظامت کے فرائض جناب انور جلال پوری نے انجام دیے۔

قونصل جنرل ڈاکٹر اوصاف سعید اور قونصلر ڈاکٹر سہیل اعجاز کی ادب دوستی اور ذاتی دلچسپی سے تینوں مشاعرے بے حد کامیاب ہوئے۔قونصلیٹ جدہ کی جانب سے نہ صرف یہ کہ جدہ اور ریاض میں شعرائے کرام کی آسائش وآرام کا خیال رکھا گیا بلکہ دو بار عمرہ اور مدینہ منورہ میں تین روز قیام کے ساتھ وہاں کی زیارت بھی کرائی گئی۔ جدہ اور ریاض کے ان مشاعروں میں جن شعرا نے شرکت کی، ان کے اسمائے گرامی ہیں: مظہر امام، مخمور سعیدی، رہبر جونپوری، ڈاکٹر شہپر رسول، منظور ہاشمی، بشر نواز، عبدالاحد ساز، انور جلال پوری، اظہر عنایتی، حق کانپوری، عادل لکھنوی، جی.ایم خواہ مخواہ، مصطفےٰ بیگ اور مظفر الدین ابدالی۔
(ڈاک سے)

● ٹورنٹو (کینیڈا)۔ غالب اکیڈمی کے بانی اور صدر اطہر رضوی نے اردو شاعری کی جس منفرد و تاریخی روایت کو گذشتہ بیس برسوں سے برقرار رکھا ہے وہ اردو دنیا میں عدیم المثال ہے۔غالب اکیڈمی کے زیر اہتمام غالب کی زمینوں میں مشاعرے منعقد ہوتے ہیں۔ غالب کی غزلیات سے دو مصرعوں کو منتخب کر کے شعرا کو طبع آزمائی کی پیشگی دعوت دی جاتی ہے۔ اب تک غالب کے چھتیس مصرعوں پر مقامی اور مہمان شعرا اپنی غزلیات پیش کر چکے ہیں۔ گذشتہ دنوں غالب کے مشہور مصرع ''تسکین کو ہم نہ روئیں جو ذوق نظر ملے'' پر ایک طرحی مشاعرہ مسی ساگا کے غالب کدہ میں منعقد ہوا جس کی صدارت پاکستان سے معروف شاعر رحمان خاور نے کی۔شعرا کرام میں رحمان خاور، رسول احمد کلیمی، کرامت غوری، اشفاق حسین، تسلیم الٰہی زلفی، عابدہ کرامت، رشید ندیم، نسرین سید، حنیف اشعر، انیس زبیری، درخشاں صدیقی، پروین سلطانہ صبا، فیصل عظیم، طلعت زہرا، رفیع رضا، اور اطہر رضوی اور حاضرین میں شکیلہ رفیق، سید محمد توصیف، پرویز پردازی، طارق نسیم، زہرہ زبیری، پرویز صلاح الدین، ثریا خان، عدیل صدیقی، ثمینہ تبسم، سہیل وہاب، رحیم انجان موجود تھے۔مشاعرے کی نظامت میزبان محفل اطہر رضوی نے کی۔
(ڈاک سے)

● نئی دہلی، 18 ستمبر۔ اردو آبزرور کی جانب سے ایوان غالب، میں موسیقار نوشاد کی یاد میں ایک کل ہند مشاعرے کا انعقاد کیا گیا جس کی صدارت حاجی عقیل بخش اور نظامت ڈاکٹر مہدی جعفری نے کی۔ بطور مہمان خصوصی دہلی پردیش کانگریس کے صدر رام بابو شرما، ڈاکٹر ایس فاروق، طلعت سلطانہ نے شرکت کی۔ اس موقعے پر گلزار دہلوی، نصرت گوالیاری، طاہر فراز، حسن کاظمی، پروفیسر عالم تلہری، سیف سحری، الطاف ضیا، ملک زادہ جاوید، معین شاداب، اقبال اشہر، آصف نظر، نوشہ خانقاہی، فصیح اکمل، انصار رضا نوری، ہاشم فیروزآبادی، صبا بلرام پوری، صبیح اثر، ریحانہ شاہین، تبسم مشتاق علی، ڈاکٹر شمس الحسن، ایشاناز وغیرہ نے اپنے کلام سے نوازا۔ معروف شاعر فاروق ارگلی نے اس موقعے پر نوشاد کا کلام پڑھ کر سنایا۔ مشاعرہ کے کنوینز عباس نگار نے آخر میں شکریہ ادا کیا۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

● سہارنپور، 27 ستمبر۔ اے جے مقبول میموریل سوسائٹی کی جانب سے میلہ گھوگھال کے موقعے پر میلہ پنڈال میں کل ہند خواتین مشاعرہ منعقد کیا گیا جس کا افتتاح کانگریس کے سینئر لیڈر رمیندر رتیجا اور سماجی کارکن اجے جین نے مشترکہ طور پر شمع روشن کر کے کیا۔ مشاعرے کی صدارت اتر پردیش اردو اکادمی کی ممبر شگفتہ خان نے کی۔

مشاعرے میں شبینہ ادیب (کانپور) ممتاز نسیم (دہلی) انا دہلوی (کانپور) رعنا تبسم (ممبئی) عارفہ شبنم (مین پوری) ریحانہ شاہین (علی گڑھ) صبا بلرامپوری، ایشا ناز (مالیر کوٹلہ) شگفتہ غزل (بریلی) صبیحہ اثر (بھوپال) نزہت امروہوی، ترنم کانپوری، عائشہ صدف (رڑکی) شائستہ شاد (کانپور) نے اپنا کلام پیش کیا۔ مشاعرے کا آغاز ندیم غیر (کانپور) نے حمد پاک اور نعت پاکؐ سے کیا۔ مشاعرے کے کنوینز شبیر شاد تھے۔ اے جے مقبول میموریل سوسائٹی کا تعارف سینئر صحافی عثمان الحق صدیقی اور سوسائٹی کے ممبر راؤ محبوب نے پیش کیا۔ فرزانہ شاہد اور شاہد زبیری نے شکریہ ادا کیا۔ (قومی آواز، دہلی)

● ممبئی۔ برہانی کالج آف کامرس اینڈ آرٹس، ممبئی میں بزمِ اردو کی جانب سے مشاعرہ منعقد کیا گیا جس میں اردو طلبہ کی ادبی کاوش "حروف" کا اجرا مشہور شاعر جناب وسیم بریلوی اور محترمہ ریحانہ اندرے کے دستِ مبارک سے ہوا۔ مشاعرے میں وسیم بریلوی، نعیم اختر، ڈاکٹر جلیل الرحمٰن، قمر سرور، سعید راہی، قمر صدیقی، عبید اعظم اعظمی، مقصود بستوی، امتیاز خلیل اور کالج کی طالبات نے اپنا کلام پیش کیا۔

مہاراشٹر کالج کے صدر شعبۂ اردو پروفیسر الیاس شوقی مہمان خصوصی تھے۔ مہمانان کا تعارف صدر شعبۂ اردو، برہانی کالج ڈاکٹر قاسم امام نے پیش کیا۔ نظامت کے فرائض شاہین، اسما اور حیناز نے ادا کیے جب کہ شکریہ کی رسم بزمِ اردو کی سکریٹری نزہت نے ادا کی۔ (ڈاک سے)

رسم اجرا

اطلاقی لسانیات

Globalisation : Language, Culture and Media

● علی گڑھ، 30 ستمبر۔ ایم. سلیم الدین، پرووائس چانسلر، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، کے ہاتھوں مجلّہ شعبۂ لسانیات "اطلاقی لسانیات" کی رسم اجرا شعبۂ لسانیات میں انجام پائی۔ اس موقعے پر انھوں نے کہا کہ شعبۂ لسانیات نے جس اہتمام سے یہ مجلّہ جاری کیا ہے اس سے مجھے یقین ہے کہ یہ مجلّہ اردو کے فروغ میں کارہائے نمایاں انجام دے گا۔ اس مجلّے میں بعض نامور شخصیات مثلاً پروفیسر مسعود حسین خاں، پروفیسر گوپی چند نارنگ، پروفیسر اومکار ناتھ کول اور پروفیسر مرزا خلیل احمد بیگ کے مضامین شامل ہیں۔

پروفیسر بی. این. پٹنائک اور پروفیسر امتیاز حسنین کی مرتب کردہ ایک دوسری اہم کتاب Globalization : Language, Culture and Media کی رسم اجرا بھی اس تقریب میں انجام پائی۔ اس جلسے کی صدارت ڈین فیکلٹی آف آرٹس، پروفیسر کے. ایم. بشرا نے کی۔

ابتدا میں پروفیسر علی رفاد فتیحی، صدر شعبۂ لسانیات نے کہا کہ پروفیسر ایم. سلیم الدین اپنی وقیع سائنسی اور علمی خدمات کے لیے بین الاقوامی شہرت رکھتے ہیں۔ وہ 100 سے زیادہ علمی کتابوں اور تحقیقی مقالوں کے مصنف ہیں۔ بایوٹیکنالوجی اور بایوکیمسٹری میں وہ پایۂ امتیاز رکھتے ہیں۔ متعدد علمی اور سائنسی اداروں نے انھیں اعزازات پیش کیے ہیں۔ اس تقریب کے اختتام پر جناب مسعود علی بیگ نیازی نے تمام مہمانان کا شکریہ ادا کیا اور نظامت ڈاکٹر شبانہ حمید، ریڈر شعبۂ لسانیات نے کی۔ (ڈاک سے)

حفیظ جونپوری— حیات اور شاعری

● جونپور۔ شعبۂ اردو الٰہ آباد یونیورسٹی کے سابق صدر ڈاکٹر سید فضل امام رضوی نے بزم شیراز کی جانب سے منعقدہ تقریب میں طفیل انصاری کی تصنیف حفیظ جونپوری— حیات اور شاعری کا اجرا کیا۔ اس موقعے پر انھوں نے حفیظ جونپوری کو غزل کا مکمل شاعر قرار دیا۔ ڈاکٹر تابش مہدی نے سیمینار کا افتتاح کیا۔ جلسے میں گورکھپور یونیورسٹی میں شعبۂ اردو کے استاد ڈاکٹر افغان اللہ خاں، الٰہ آباد ہائی کورٹ کے سینئر وکیل ایم اے قدیر، ایس ایم عباس مولانا آزاد انٹر کالج پرتاپ گڑھ میں اردو کے استاد عارف حسین جونپوری، ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی، ٹی ڈی پوسٹ گریجویٹ کالج جونپور کے ڈاکٹر شکیل احمد انصاری وغیرہ نے حفیظ جونپوری کی حیات اور شاعری پر روشنی ڈالی۔

(ڈاک سے)

سہ ماہی "مطالعات"

● نئی دہلی۔ راجیہ سبھا کے ڈپٹی چیئرمین کے رحمٰن خاں کے بدست ایک سہ ماہی علمی رسالے "مطالعات" کا اجرا عمل میں آیا۔ اس موقعے پر جناب کے رحمٰن خاں نے کہا کہ میں امید کرتا ہوں کہ علمی اور تحقیقی مضامین پر مشتمل یہ جریدہ عوام اور خواص دونوں میں مقبول ہوگا اور اردو میں نئی علمی روایات قائم کرے گا۔ انھوں نے تعلیم کے فروغ، مختلف فرقوں میں باہمی اعتماد و اتفاق اور علمی و دینی معلومات سے متعلق اشاعتوں پر انسٹی ٹیوٹ آف آبجیکٹیو اسٹڈیز کو مبارک باد بھی دی۔

جامعہ ہمدرد کے چانسلر سید حامد کی صدارت میں منعقد اس تقریب سے خطاب کرتے ہوئے پروفیسر اوصاف احمد نے مطالعات کے حوالے سے تحقیقی، علمی اور ادبی صلاحیتوں کو ابھارنے پر زور دیا۔ پروفیسر ظہور محمد خاں نے خیر مقدمی تقریر کی۔ مطالعات، انسٹی ٹیوٹ کے بانی اور چیئرمین ڈاکٹر منظور عالم اور ڈاکٹر اوصاف احمد کی ادارت میں شائع ہوگا۔ (قومی آواز، دہلی)

اے ارضِ فلسطین

● نئی دہلی، 12 ستمبر۔ ادارۂ ادب اسلامی ہند کی جانب سے جماعت اسلامی ہند میں دو اہم کتابوں کی تقریب اجرا منعقد ہوئی جس کی صدارت ڈاکٹر محمد عبدالحق انصاری امیر جماعت اسلامی ہند نے اور نظامت کے فرائض جناب انتظار نعیم جنرل سکریٹری ادارۂ ادب اسلامی ہند، بہ اشتراک ڈاکٹر تابش مہدی نے انجام دیے۔ فلسطین سے متعلق مختلف شعرا کی منظومات پر مشتمل مجموعہ "اے ارضِ فلسطین" کا اجرا سفیر فلسطین عزت مآب جناب اسامہ موسیٰ نے کیا۔ دوسری کتاب "ڈاکٹر ابن فرید: بے بدل انسان — بے مثل قلم کار" کی رسمِ رونمائی دہلی یونیورسٹی کے سابق صدر شعبۂ اردو پروفیسر عبدالحق نے انجام دی۔ آغاز میں جناب اعجاز احمد اسلم ایڈیٹر "ریڈینس ویکلی" نے سفیر فلسطین کا تعارف پیش کیا۔ سفیر فلسطین نے کہا کہ "میں آپ کے اس تعاون کا شکر گزار ہوں اور یقین رکھتا ہوں کہ حکومتِ ہند کا تعاون بھی ہمیں حسب سابق ملتا رہے گا۔"

ڈاکٹر شاہد حسین صدر شعبۂ اردو جے این یو نے کہا کہ احتجاج کرنا انسانی حق ہے اور غیر انسانی عمل کے خلاف جدو جہد جاری رہنی چاہیے۔ جناب محمد جعفر نے ڈاکٹر ابن فرید مرحوم کی شخصیت اور فن پر اظہار خیال کرتے ہوئے ان کی تنقیدی تحریروں کی اہمیت پر روشنی ڈالی اور اصلاح نسواں کے ضمن ڈاکٹر ابن فرید کی خدمات کا ذکر کرتے ہوئے ماہنامہ "حجاب" رامپور کو سنگِ میل قرار دیا۔

پروفیسر عبدالحق نے ڈاکٹر ابن فرید کے ساتھ اپنے نجی تعلقات سے واقف کرایا۔ اجرا کے بعد مختصر شعری نشست بھی منعقد ہوئی جس میں اجمل ناز فاروقی، ابوالمجاہد زاہد، شبنم سبحانی، قمر سنبھلی، ڈاکٹر ظفر مراد آبادی، ڈاکٹر تابش مہدی اور انتظار نعیم نے اپنا کلام پیش کیا۔

ادارۂ ادب اسلامی ہند کے صدر ڈاکٹر سید عبدالباری شبنم سبحانی نے ادارے کا تعارف کراتے ہوئے مختصر طور پر دونوں کتابوں کی افادیت پر روشنی ڈالی۔ آخر میں جناب انتظار نعیم نے شکریہ ادا کیا۔ (ڈاک سے)

لکڑی کا گھوڑا

● کولکاتا، 26 اگست۔ کولکاتا کے مضافاتی شہر کمرہٹی میں شاعر ممتاز انور کی بچوں کے لیے لکھی گئی نظموں کا مجموعہ بیک وقت اردو اور ہندی میں "لکڑی کا گھوڑا" کے نام سے انجمن ترقی اردو ہند، مغربی بنگال کی علاقائی شاخ کے زیر اہتمام منظر عام پر آیا ہے۔ اس شعری مجموعے کی رسم اجرا پروفیسر سلیمان خورشید (جنرل سکریٹری انجمن ترقی اردو ہند، مغربی بنگال) اور جناب جے این سنگھ (پرنسپل آئیڈیل کیمبرج اکیڈمی) کے ہاتھوں انجام پائی۔

(ڈاک سے)

ہم اور ہماری صحت

● حیدر آباد۔ مشہور فلم اداکارہ وحیدہ رحمٰن نے فریدہ راج کی کتاب "ہم اور ہماری صحت" کی رسم اجرا انجام دیتے ہوئے کہا کہ کتاب میں کئی ایسے مسائل پر روشنی ڈالی گئی ہے جو کہ عام طور پر خواتین اور لڑکیاں اپنی والدہ یا ڈاکٹر سے بھی کہتے ہوئے جھجکتی ہیں۔ انھوں نے کہا کہ اردو زبان میں اس موضوع پر یہ پہلی کتاب ہے۔ انھوں نے امید ظاہر کی کہ اس کتاب کے ذریعے خواتین اور لڑکیاں کئی مسائل سے واقف ہو سکیں گی۔ ممتاز افسانہ نگار محترمہ جیلانی بانو نے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ "قدرت نے عورت کو انسان کی تخلیق کی ذمہ داری دی ہے اور تخلیق کے اہم فرض کو پورا کرنے کے لیے عورت کو کئی کٹھن مرحلوں سے گزرنا پڑتا ہے۔" اس موقعے پر پرنسپل سکریٹری میڈیکل اینڈ ہیلتھ جناب آئی. وی سبا راؤ اور مدیر روزنامہ "سیاست" جناب زاہد علی خاں نے بھی خطاب کیا۔ فریدہ راج نے اس موقعے پر اعلان کیا کہ وہ یہ کتاب اپنے والدہ کے نام معنون کرتی ہیں جنھوں نے انھیں آج اس مقام پر پہنچایا ہے۔ تقریب کی کارروائی جناب اسلم فرشوری نے چلائی۔

(ڈاک سے)

جانے والوں کی یاد

باقر مہدی

● ممبئی۔ ممتاز ترقی پسند شاعر اور ناقد باقر مہدی کا 25 ستمبر کی رات انتقال ہو گیا۔ ان کی عمر 77 سال تھی اور طویل مدت سے بیمار تھے۔ پسماندگان میں صرف بیوہ خیرالنسا مہدی ہیں۔ باقر مہدی کی تدفین 25 ستمبر کی سہ پہر رحمت آباد شیعہ قبرستان میں ہوئی۔ اس وقت مرحوم کے دیگر احباب سمیت اردو، ہندی اور انگریزی کے متعدد ادیب، شاعر، صحافی اور اساتذہ موجود تھے، جن میں فضیل جعفری، یعقوب راہی، شمیم عباس، انور قمر، الیاس شوقی، علی امام نقوی، ساجد رشید کے نام نمایاں ہیں۔ باقر مہدی 11 فروری 1929 کو اتر پردیش کے قصبہ ردولی میں پیدا ہوئے تھے۔ انھوں نے لکھنؤ، علی گڑھ اور ممبئی یونیورسٹی سے اقتصادیات اور جمالیات میں ایم اے کیا لیکن کبھی ملازمت نہیں کی۔ ان کی شاعری اور تنقیدی مضامین کی تقریباً دس کتابیں شائع ہوئی ہیں۔ ان کے شعری مجموعے ''شہر آرزو'' (1958) ''کالے کاغذ کی نظمیں'' (1967) ''ٹوٹے شیشے کی آخری نظمیں'' (1971) ''سیاہ سیاہ'' (1993) اور تنقیدی مضامین کے مجموعے ''آگہی و بے باکی'' (1965) ''تنقیدی کشمکش'' (1979) ''شعری آگہی'' (2000) ''تین رخی نظریاتی ادبی تنقیدی کشمکش'' (2003) اور ''نیم رخ'' (خاکے 2005) ہیں۔ ان کے علاوہ ان کی ترتیب کردہ دو نثری کتابیں زیر اشاعت ہیں۔ پہلی کتاب ہے ''کچھ راجندر سنگھ بیدی کے بارے میں'' اور دوسری ''ترقی پسندی سے جدیدیت تک''۔

باقر مہدی کی موت پر رنج و غم کا اظہار کرتے ہوئے قومی اردو کونسل کے وائس چیئرمین جناب شمس الرحمن فاروقی نے کہا کہ باقر مہدی کی موت صرف ایک اعلیٰ درجے کے نقاد، شاعر اور ماہر علم مجلسی کی موت نہیں ہے۔ باقر مہدی کی موت ایک دانشور کی موت ہے۔ دانشور سے مراد صرف یہ نہیں کہ بہت سی کتابیں پڑھنے والا اور حالات حاضرہ پر نظر رکھنے والا شخص دانشور کہلاتا ہے، دانشور کی صحیح تعریف یہ ہے کہ وہ تمام معاملات میں اپنی رائے قائم کرتا ہے اور خود کو اکثریت کی رائے کا پابند نہیں سمجھتا۔ باقر مہدی میں یہ صفت ہمیشہ سے موجود تھی۔ لکھنؤ اور علی گڑھ میں طالب علمی کے زمانے میں انھوں نے اس وقت کے بہت بڑے بڑے علما کے درس اور تدریس سے استفادہ کیا۔ اس زمانے میں بھی انھوں نے اپنی رائے خود بنائی۔ انھوں نے ادبی زندگی کا آغاز ترقی پسند عہد میں کیا۔ افکار و خیالات کے اعتبار سے وہ کئی معنی میں بائیں بازو کے تصورات سے متاثر تھے لیکن وہ ترقی پسندوں سے مقلد یا سراسر ہمنوا کبھی نہیں رہے۔ جب جدیدیت کا دور دورہ ہوا تو جدید لکھنے والوں نے کئی باتوں میں انھیں اپنا نمونہ تسلیم کیا لیکن باقر مہدی کو جدیدیت کا بھی ہمنوا نہیں کہا جا سکتا ہے۔ گذشتہ دس پندرہ برس میں جو نئے فیشن اردو ادب میں لائے جا رہے ہیں، باقر مہدی ان کے بھی پاسدار نہ تھے اور یہاں بھی وہ اپنے ہی مطالعے اور صوابدید کی روشنی میں اپنی بات کہتے تھے۔ یہ میرے لیے بہت رنج کا موقع ہے کہ باقر مہدی جیسا بے خوف اور آزادہ رو ادیب اب ہمارے درمیان نہیں ہے۔

سہ ماہی ''ذہن جدید'' کے مدیر جناب زبیر رضوی نے اپنے تعزیتی بیان میں کہا کہ باقر مہدی اپنے عہد کے بیشتر شاعروں سے نہ صرف اپنے آداب زندگی میں مختلف تھے بلکہ انھوں نے شاعری بھی اپنے برہم اور بپھر جانے والے لہجے میں اس طرح کی کہ وہ سب سے الگ پہچانے جانے لگے۔ انھوں نے ترقی پسندی سے اپنے گہرے کمٹمنٹ کے باوجود اس کو اپنی جارحانہ اور باغیانہ تنقید کا نشانہ بنایا اور جب 1960 کے بعد جدید شاعری کی سربلندی کا چرچا ہوا تو یہاں بھی باقر مہدی نے جدید شاعری کی دستار میں 'کج کلہی' کا جلال نہ پا کر جدید شاعروں کی صف میں کھڑا ہونے سے انکار کر دیا۔ وہ ادب میں بے لاگ ہو کر لکھنے اور سوچنے کے حامی تھے، اسی لیے ان کی ادبی گفتگو یا تحریروں میں توصیفی ٹکڑے اسی وقت راہ یا جگہ پاتے تھے جب اس کے بغیر تحریر کے یک رخی ہونے کا اندیشہ بڑھ جائے۔ عالمی ادب اور خود ہندوستانی ادب میں جن ادیبوں نے احتجاج اور مزاحمت کی راہ اختیار کی تھی، وہ سارے باقر مہدی کا آدرش تھے۔ باقر مہدی کی اسی حق گوئی اور سچے اور کھرے ادب کی آب یاری میں ان کے یقین نے انھیں ادبی حلقوں میں جا کر غیر ضروری دوستیاں کرنے سے روکے رکھا۔ وہ تعلق کے معاملے میں بڑے حساس تھے، اسی لیے بڑی حد تک الگ تھلگ اور اپنے ادبی افکار کے ساتھ ادبی زندگی بسر کرنا پسند کرتے تھے۔

باقر مہدی نے اردو میں ایک بے حد رجحان ساز رسالہ 'اظہار' نکالا تھا۔ ان کی کلیات 'سیاہ سیاہ' کے نام سے 1993 میں شائع ہوئی تھی۔ اس کلیات میں ان کے تین شعری مجموعوں شہر آرزو، کالے کاغذ کی نظمیں اور ٹوٹے شیشے کی آخری نظمیں شامل تھیں۔

ممبئی میں اختر الایمان باقر مہدی کے پڑوسی تھے۔ وہ اختر الایمان، ن م راشد اور فیض کی شاعری کے دلدادہ تھے۔ ان کی تنقید نے بھی اردو میں بہت سے مباحث کے در کھولے تھے۔ یعقوب راہی نے ابھی کچھ ماہ پہلے باقر مہدی کی عصری آگہی اور شاعری پر ایک تفصیلی کتاب شائع کی تھی۔

فکشن نقاد پروفیسر شمس الحق عثمانی نے اظہار تعزیت کرتے ہوئے کہا کہ میری نظر میں ان کی سب سے زیادہ عزت اس لیے تھی کہ ان کے پاس ایک

آزاد ذہن اور آزاد ضمیر تھا جو کہ کسی ادیب کا اصل سرمایہ ہوتا ہے۔ اس عہد میں منٹو کے بعد کوئی دوسرا ایسا شخص نظر نہیں آتا۔

اختر سعید خاں

● بھوپال۔مشہور شاعر اختر سعید خاں کا طویل علالت کے بعد 10 ستمبر کی شب انتقال ہوگیا۔ انھیں 11 ستمبر صبح منگل واڑہ میں واقع قبرستان میں دفن کر دیا گیا۔صف اول کے ترقی پسند شاعر 83 سالہ اختر سعید خاں کے پسماندگان میں تین بیٹے اور چار بیٹیاں ہیں۔ انھیں مدھیہ پردیش حکومت نے ریاست کے سب سے بڑا انعام 'اقبال انعام' اور مدھیہ پردیش اردو اکادمی نے اپنا اعلیٰ ترین میر تقی میر انعام پیش کیا تھا۔ اکادمی کے صدر بشیر بدر نے ان کی موت پر افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ فیض احمد فیض، سردار جعفری اور مجروح سلطان پوری کی صف کا ایک اور بڑا شاعر ہمارے درمیان سے اٹھ گیا۔

کونسل کے وائس چیئرمین جناب شمس الرحمن فاروقی نے اپنے تعزیتی بیان میں کہا ہے کہ اختر سعید خاں کی موت محض ایک غزل گو کی موت نہیں ہے، وہ ہند اسلامی تہذیب کے اس ماحول کی شاید آخری یادگار تھے جسے ہم بھوپال کی تہذیب کا نام دیتے ہیں۔ وہ زندگی میں جس قدر نستعلیق، خوش گفتار اور پابند وضع تھے، اپنی غزل گوئی میں بھی انھی صفات کا پورا پورا اظہار کرتے تھے۔ اختر سعید خاں کی موت معاصر اردو ادب میں ایک خلا چھوڑ گئی ہے۔

اختر سعید خاں کی رحلت پر الہ آباد میں ایک تعزیتی جلسے کا اہتمام کیا گیا جس کی صدارت ممتاز ترقی پسند نقاد پروفیسر سید محمد عقیل نے کی۔ انھوں نے کہا کہ اختر سعید خاں بنیادی طور پر کلاسیکی مزاج و تہذیب کے شاعر تھے۔ وہ ان معنوں میں انقلابی نہ تھے جیسا کہ اشتراکی ہوا کرتے ہیں۔ غالب اور اصغر ان کے پسندیدہ شاعر تھے۔ اپنے ہم عصروں میں وہ مجروح سے زیادہ متاثر تھے۔ وہ بے حد ملنسار اور مروت والے انسان تھے، نام و نمود اور شہرت کے پیچھے کبھی نہیں بھاگے۔ ان کی موت سے ہم نے گوہر بے بہا کھو دیا۔ پروفیسر علی احمد فاطمی، ڈاکٹر فخر الکریم، ڈاکٹر حسنین اختر اور افسانہ نگار اسرار گاندھی نے اس جلسے میں مرحوم کی شخصیت اور کارناموں پر روشنی ڈالی۔

نوئیڈا۔صبا اپارٹمنٹ نوئیڈا میں ممتاز شاعر جناب رفعت سروش کے مکان پر اختر سعید خاں کی یاد میں ایک تعزیتی جلسہ بزرگ شاعر گلزار دہلوی کی صدارت میں منعقد ہوا، اس جلسے میں یو پی اردو اکیڈمی کے چیئرمین پروفیسر ملک زادہ منظور احمد بھی شریک ہوئے۔ رفعت سروش نے اپنے تاثرات بیان کرتے ہوئے کہا کہ مرحوم اپنی ذات سے ایک ادارہ تھے۔ وہ اردو غزل کی تہذیب کے علم بردار تھے۔ وہ ایک نہایت شفیق دوست، عالم، شاعر اور ترقی پسند تحریک کے ایک اہم ستون تھے۔ ان کی وفات میرے لیے ذاتی غم ہے اور اردو زبان و ادب کا ناقابل تلافی نقصان۔

پروفیسر ملک زادہ منظور احمد نے اختر سعید خاں کی ہر دلعزیز شخصیت اور ان کی غزل کے حوالے سے گفتگو کی۔ رند ساغری، فصیح اکمل قادری، انور نزہت، ملک زادہ جاوید، ڈاکٹر شبانہ نذیر، ربا سروش، اور محمود عالم نے بھی اظہار خیال کیا۔ آخر میں جناب گلزار دہلوی نے اپنے ذاتی تعلقات کے حوالے سے کہا کہ اختر سعید خاں ایک نفیس انسان، اعلیٰ درجے کے شاعر اور وضع دار انسان تھے۔ بڑی بات یہ ہے کہ وہ بیماری کے باوجود آخر وقت تک فعال رہے اور ان کا تازہ کلام رسائل میں شائع ہوتا رہا۔

مخدوم زادہ مختار عثمانی

● نئی دہلی، 24 ستمبر۔دہلی کی ادبی و شعری محفلوں کی جان، ہر دل عزیز شخصیت اور معروف شاعر مخدوم زادہ مختار عثمانی کا 24 ستمبر کی صبح شریف منزل بلی ماران میں انتقال ہوگیا۔ان کی عمر 55 سال تھی اور وہ غیر شادی شدہ تھے۔ ان کے پسماندگان میں تین بھائی اور دو بہنیں شامل ہیں۔مخدوم زادہ مختار عثمانی قیصر حیدری مرحوم کے شاگرد اور صوفی صادق کے مرید تھے۔ وہ انتہائی ملنسار اور مخلص انسان تھے۔ وہ اپنی وضع قطع کے سبب بھی لوگوں میں بے حد مقبول تھے اور دہلی کے مشاعروں کی رونق تھے۔ان کی نماز جنازہ دہلی گیٹ پر پڑھائی گئی اور بعد نماز عصر قبرستان دہلی گیٹ میں انھیں سپرد خاک کر دیا گیا۔ اس موقعے پر ان کے عزیز و اقارب کے علاوہ دہلی کی کئی سرکردہ شخصیات، معروف شعرا اور ادیبوں نے شرکت کی جن میں میونسپل کونسلر سید نثار حسین، ڈاکٹر عقیل احمد، حاجی میاں فیاض الدین، عتیق صدیقی، گلزار دہلوی، وقار مانوی، نصرت گوالیاری، ابرار کرتپوری، ڈاکٹر ظفر مرادآبادی، متین امروہوی، منیر ہمدم، شہباز ندیم ضیائی، انور باری، شمس رمزی، عرفان اعظمی، صالحین فہمی، اعجاز انصاری، رؤف رضا، معین شاداب، جاوید مشیری، اقبال اشہر، محمد شمیم، مرزا محمد عارف، بھائی تقو، اقبال فردوسی، انتظار نعیم، بدر منیر، عادل رشیدی، امتیاز صدیقی، فصیح اکمل، منیر انجم وغیرہ شامل تھے۔

مخدوم زادہ مختار عثمانی کی موت پر اظہار تعزیت کرتے ہوئے جناب شمس الرحمن فاروقی، وائس چیئرمین، قومی اردو کونسل نے کہا کہ وہ بڑی خوبیوں کے انسان تھے۔

□□□

تبصرہ و تعارف

آزادی کے بعد اردو نظم (ایک انتخاب)
ترتیب: شمیم حنفی، مظہر مہدی
صفحات: 758، قیمت: 384 روپے
ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک۔1، ونگ۔6، آر. کے. پورم، نئی دہلی۔110066
مبصر: احمد محفوظ، شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی۔110025

شعر و ادب کے اچھے انتخابات کو ہمیشہ قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ یہ ہر زمانے میں شائقین ادب کے ذوق کی تسکین کا باعث رہے ہیں۔ چنانچہ جہاں ایک طرف کسی مخصوص ادیب/شاعر کی تخلیقات کا انتخاب ہمارے لیے مفید ہوتا ہے وہیں دوسری طرف کسی خاص عہد کو بنیاد بنا کر اس سے متعلق ادبا اور شعرا کی منتخب تخلیقات جب یکجا صورت میں سامنے لائی جاتی ہیں تو یہ انتخاب مزید بارآور اور سودمند ثابت ہوتا ہے، لیکن اس کارگزاری کے لیے بنیادی شرط اچھی اور معیاری تخلیقات کو جمع کرنے کی ہوتی ہے۔ زیر نظر کتاب اس لحاظ سے بہت عمدہ اور مفید کہی جا سکتی ہے کہ اس میں آزادی کے بعد کے زمانے کو سامنے رکھ کر اردو نظموں کا خوبصورت انتخاب پیش کیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں انتخاب کا عمل دو سطحوں پر کیا گیا ہے۔ پہلی سطح یہ کہ مذکورہ عہد سے تعلق رکھنے والے ان شعرا کو اس کتاب میں شامل کیا گیا ہے جو اس عہد کے نہ صرف نمائندہ ہوں بلکہ ان کا مقام اور مرتبہ بھی انتخاب میں شمولیت کا جواز فراہم کرتا ہو۔ دوسری سطح وہ رہی ہے جہاں شاعر کی نظموں کو منتخب کرنے کا مرحلہ درپیش تھا۔ ہم پورے اعتماد کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ دونوں سطحوں پر مرتبین اپنے مقاصد میں حد درجہ کامیاب ہیں۔

چونکہ انتخاب کا عمل ہی ایسا ہے کہ اس میں ذاتی پسند و ناپسند اور ذاتی نقطۂ نظر کا خاصا دخل ہوتا ہے اور چونکہ ہر شخص کی پسند اور نقطۂ نظر کا یکساں ہونا ضروری نہیں، اس لیے یہ توقع کرنا کہ کسی انتخاب سے تمام لوگ پوری طرح مطمئن ہوں گے، فضول ہے۔ البتہ کسی اچھے اور معیاری انتخاب کو پیش کرتے ہوئے مرتب یا مرتبین سے ہم جن اصولی باتوں کا تقاضا کر سکتے ہیں، ان کا اظہار کتاب کے مقدمے میں بڑی صراحت سے کر دیا گیا ہے۔ چنانچہ ان اصولوں کے پیش نظر اس طرح کے سوالات یا اعتراضات کی گنجائش نہیں رہ جاتی کہ اس انتخاب میں فلاں شاعر کیوں شامل ہے اور فلاں شاعر کیوں شامل نہیں ہے۔ یا فلاں نظم کی شمولیت نامناسب ہے یا فلاں نظم کی بجائے فلاں نظم شامل ہونی چاہیے تھی۔ شعرا کے ناموں کے انتخاب کے سلسلے میں ''مقدمہ'' کی درج ذیل عبارت بڑی خوبی کے ساتھ صورت حال کی وضاحت کرتی ہے۔

''یہ 1950 کے آس پاس کے تمام اہم نظم گویوں یا 1950 کے بعد اردو نظم کے منظر نامے پر ابھرنے والی نسل کے تمام شعرا کے کلام کا انتخاب نہیں ہے۔ اس نوع کے کسی بھی انتخاب سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ اس میں جس عہد کا احاطہ کیا گیا ہے اس کے تمام شعرا کے کلام کا نمونہ پیش کیا جائے گا۔''

اس انتخاب کی وسعت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس میں 67 شعرا کی 245 نظمیں شامل ہیں۔ بقول مرتبین شاعروں اور نظموں کی تعداد میں مزید اضافہ ہو سکتا تھا، اگر کتاب کی ضخامت کے حد درجہ بڑھ جانے کا اندیشہ نہ ہوتا۔ واضح رہے کہ موجودہ صورت میں کتاب 758 صفحات پر مشتمل ہے جو یقیناً خاصی ضخیم کہی جا سکتی ہے۔ موجودہ ضخامت کا ایک بنیادی سبب یہ بھی ہے کہ اس کتاب کو اردو کے ساتھ ساتھ ناگری رسم خط میں بھی شائع کیا گیا ہے۔ اس کا مقصد اردو شعر و ادب سے دلچسپی رکھنے والے غیر اردو داں قارئین کو باخبر کرنا ہے۔ اس مقصد اور منصوبے کے تحت قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے کچھ دیگر کتابیں بھی اسی طرح اردو اور ناگری رسوم خط میں ایک ساتھ شائع کی ہیں۔

شعرا اور ان کے کلام کا انتخاب ہی بذات خود نہایت محنت طلب کام تھا، اس پر ناگری رسم خط میں کلام کی شمولیت نے مرتبین کے کام کو بلاشبہ اور زیادہ دشوار بنا دیا۔ خصوصاً ایسی صورت حال میں جب اردو کے الفاظ اور تلفظات کو ناگری رسم خط میں منتقل کیا گیا ہے۔ اس کی داد نہ دینا بددیانتی ہوگی۔ مزید برآں ناگری رسم خط میں کہیں کہیں کچھ مشکل الفاظ و تراکیب کے معنی بھی دے دیے گئے ہیں۔ اس سے اس انتخاب کی افادیت اور بڑھ گئی ہے۔ البتہ کہیں کہیں اس کتاب میں ایسے تسامحات/اغلاط بھی راہ پا گئے ہیں جو اگر نہ ہوتے تو اور بھی اچھا ہوتا۔ مثلاً کتاب کے صفحہ 59 پر اسرارالحق مجاز کی ایک نظم ''وطن آشوب'' شامل ہے جو عنوان میں ''وطنِ آشوب'' درج ہے۔ یہ اس لیے غلط ہے کہ یہ ترکیب بھی ''شہر آشوب'' کی طرح ہے اور ہم جانتے ہیں کہ ''شہر'' میں اضافت نہیں ہے۔ اس نظم میں ایک مصرع ہے ''ایک سکوت ہر طرف ہوش ربا و ہولناک''۔ ظاہر ہے یہ مصرع اسی بحر میں ہے جس میں اقبال کی مشہور نظم ''ذوق و شوق'' کہی گئی ہے۔ اس کا وزن مفتعلن مفاعلن دو بار ہے۔ یہاں کتاب میں مذکورہ بالا مصرعے میں ''ایک'' کے بجائے ''یک'' درج ہے جس سے مصرع ناموزوں ہو گیا ہے۔ یہاں الف کے رہ جانے کو کمپوزنگ یا پروف کی غلطی اس لیے نہیں کہہ سکتے کہ سامنے کے صفحے پر ہندی میں بھی

''ایک'' کے بجائے '' یک'' ہی لکھا ہوا ہے۔ اسی نظم میں فٹ نوٹ کے تحت معنی کے بیان میں بھی ایک سہو در آیا ہے۔ نظم میں لفظ '' دلستاں'' آیا ہے۔ اس کے معنی بیان کیے گئے ہیں ''دل کو ستانے والی''۔ یہ معنی صحیح نہیں ہیں۔ '' دلستاں'' کے درست معنی ہیں دل لینے والی/روالا اور اس میں ستاں کا لاحقہ فارسی مصدر '' ستاندن'' سے مشتق ہے جس کے معنی ''لینا'' کے ہیں۔

اس کتاب کے مرتبین اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان مبارک باد کے مستحق ہیں کہ ان کی کوششوں کے نتیجے میں اردو نظموں کا ایسا عمدہ اور حد درجہ معیاری انتخاب منظر عام پر آیا ہے۔ امید ہے یہ کتاب اردو اور ہندی دونوں حلقوں میں یکساں طور پر مقبولیت حاصل کرے گی۔

نورتن کہانیاں/شمیم احمد

قیمت:-/23 روپے، صفحات:192

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک۔1، ونگ۔6، آر۔کے۔ پورم، نئی دہلی۔110066

مبصر: رئیس احمد، 1007، سیکٹر۔1، آر۔کے۔ پورم، نئی دہلی۔110022

'' نورتن کہانیاں'' کا اولین ایڈیشن 1980 میں منظر عام پر آیا تھا، چوتھا ایڈیشن حال ہی میں منظر عام پر آیا ہے۔ اس کتاب میں مرتب نے محمد بخش مہجور کی کتاب '' نورتن'' سے مختلف 57 کہانیاں منتخب کی ہیں جنھیں بچوں کی ذہنیت اور نفسیات کے پیش نظر سادہ، سلیس اور دلکش انداز میں پیش کیا ہے ساتھ ہی کہانی کے مقصد اور قصے کو جوں کا توں برقرار رکھا ہے۔

قدیم اردو نثر کی تاریخ میں محمد بخش مہجور کی '' نورتن'' کو زمانی اعتبار سے تاریخی اہمیت حاصل ہے۔ یہ کتاب '' فسانۂ عجائب'' سے دس سال قبل کی تصنیف ہے۔ مہجور نے اس میں نو ابواب قائم کیے ہیں اور اسی مناسبت سے اس کا نام '' نورتن'' رکھا گیا ہے۔ ہر باب مختلف دلچسپ کہانیوں پر مشتمل ہے۔

شمیم احمد نے مہجور کی اسی تصنیف کے مختلف ابواب سے بچوں کی ذہنیت اور معیار کے مطابق بعض کہانیاں منتخب کی ہیں، یہی وجہ ہے کہ اس انتخاب میں '' نورتن'' کی ترتیب کو ملحوظ خاطر نہیں رکھا گیا ہے۔ '' نورتن'' میں شامل بیشتر کہانیاں مہجور کی افتادِ طبع کا نتیجہ ہیں اور بعض کہانیاں ایسی بھی ہیں جو معمولی اختلافات کے ساتھ روایت در روایت اور سینہ بہ سینہ چلی آرہی ہیں۔ ان حکایات کے مطالعے سے لکھنؤ کی قدیم اردو نثر پر بھی روشنی پڑتی ہے اور اس ضمن میں بحیثیت قصہ گو محمد بخش مہجور کی ادبی حیثیت پر بھی رائے قائم کرنے میں مدد ملتی ہے۔

یہ کتاب چھ ابواب میں منقسم ہے، پہلے باب میں '' عقل مندوں کی کہانیاں'' کے عنوان سے نو کہانیاں ہیں جن میں بزدل شیر، عورت، چیتا اور لومڑی، شیر بچہ اور بڑھئی، گانے والی بکری، انوکھی تقسیم، تین سوال ایک جواب، کیڑوں کی دعوت، اپنی قضا نہ جانی اور سو سنار کی ایک لوہار کی، کہانیاں شامل ہیں۔ دوسرے باب میں '' فریادیوں اور عادلوں کی کہانیاں'' کے تحت چودہ کہانیاں ہیں جن میں بے ایمان قاضی، مایا ملی نہ رام، بے ایمان بھائی، درخت کی گواہی، پانی کی گواہی، اشرفیوں کی چوری، عقل مند حاکم، ایک کے بدلے دو، آقا اور غلام، گوشت کی شرط، اصلی ماں، روئی کی چوری، انصاف کی چھڑی اور شرط کی شرط جیسی کہانیاں یکجا کی گئی ہیں۔ یہ کہانیاں سبق آموز ہونے کے ساتھ ساتھ نہایت دلچسپ بھی ہیں۔

تیسرے باب میں '' بے وقوفوں کی کہانیاں'' کے زیر عنوان کل نو کہانیاں جمع کی گئی ہیں جن میں فلسفی نوکر، چار بے وقوف اور ایک بڑھیا، بھلا آدمی، یک نہ شد دو شد، بیوہ بیوی، داڑھی میں آگ، حماقت کا بوجھ، گدھا گم ہونے کی خوشی اور شیطان کی داڑھی شامل ہیں۔ چوتھے باب میں '' ظریفوں کی کہانیاں'' کے عنوان سے چودہ کہانیاں ہیں جن میں ایک ٹانگ کا مرغ، پہلے دن کی دیوانگی، اندھا دولت، دو کوے، اس میں کیا شک ہے، دوہرا انعام، تم بھی خوش ہم بھی خوش، اندھے کا چراغ، اندھا دوست، آدھا منہ کالا، دو گدھوں کا بوجھ، ناخوشی کے دن خوشی، قسم کھانے اور پان والے، شامل انتخاب ہیں۔ یہ کہانیاں لطافت بیان اور مجمل بیانی کے علاوہ ظرافت نگاری کا عمدہ نمونہ ہیں۔

پانچویں باب میں افیونیوں کی کہانیاں، ہیں جن میں اپنے گھر کا مہمان، تیسرا نوکر، گنے کا کھیت، گھوڑا کہاں ہے اور دودھ کا کیک، شامل ہیں اور چھٹے باب میں بخیلوں سے متعلق چھ کہانیاں منتخب کی گئی ہیں جن کے عنوانات کرامت والی کشتی، حضرت رمضان، کبھی مشرق، کبھی مغرب، دو کنجوسوں کی ملاقات، مہمان نوازی اور خالی انگلی ہیں۔ بہ اعتبار مجموعی یہ تمام کہانیاں بچوں کے ساتھ ساتھ بالغوں کے لیے بھی ذہنی تفریح اور دلچسپی کا سامان فراہم کرتی ہیں۔

بچوں کے ڈرامے/اظہار افسر

قیمت:-/18 روپے، صفحات:97

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک۔1، ونگ۔6، آر۔کے۔ پورم، نئی دہلی۔110066

مبصر: احمد کفیل، E-301، برہم پترا ہاسٹل، جے این یو، نئی دہلی۔110067

اظہار افسر نے بچوں کے لیے عمدہ ڈرامے لکھے ہیں۔ ایک فن کار اچھی تخلیق اسی وقت پیش کر سکتا ہے جب وہ قاری کی نفسیات اور اس کے ماحول سے واقف ہو۔ اظہار افسر نے ان ڈراموں میں اپنے مشاہدے کو بہتر طور پر پیش کیا ہے۔ یہ کتاب کل بارہ ڈراموں کا انتخاب ہے جو بالترتیب راکٹ کا نقشہ، چنانچہ، ننھی سی لڑکی، دو دوست، شکریہ، ایک روپیہ فی مکان، بڑے دنوں بعد، مچھلی کا شکار، محنت کا پھل، سیاہی صاف، موتی، بقلم خود جیسے عنوانات پر مشتمل ہیں۔ ان ڈراموں کی تخلیق میں مصنف نے بچوں کی نفسیات، مزاج اور ذوق کا خاص خیال رکھا ہے۔ بچوں کی زندگی میں پڑھنے لکھنے، کھانے پینے

اور کھیلنے کودنے سے لے کر غور و فکر میں جو اہم اور غیر معمولی واقعات رونما ہوتے رہتے ہیں ان کی عکاسی ان ڈراموں میں بخوبی کی گئی ہے۔ بچوں کی زبان، ان کے تکیۂ کلام، بھائی بہن کا پیار، خدمت خلق، آیا کی لا پرواہی، بے کسوں اور بے سہاروں کی مدد، بلا تفریق قوم و ملت دوستی اور دوستانہ ماحول سازی، کھیل تماشے سے انسیت اور کھیل کود میں ہی تعمیری و ترقیاتی کاموں سے رغبت پیدا کرنے کی صلاحیت جیسے نکتوں کو ان ڈراموں کی بنیاد بنایا گیا ہے۔ بچوں کی معصومانہ شرارتیں جن کے انجام سے وہ بے خبر ہوتے ہیں اگر بروقت ان کو سمجھایا جائے تو وہ برے انجام اور برے کاموں سے محفوظ رہ سکتے ہیں۔

گرد و پیش کے چال باز اور چاپلوسی لوگ جو معصوم بچوں کے ذریعے اپنا الو سیدھا کرتے ہیں ایسے لوگوں سے محتاط رہنے کا شعور پیدا کرنا بہت ضروری ہے۔ کچھ بچے اس قدر ضدی ہوتے ہیں کہ ان کی خواہشوں کا احترام نہ کیا جائے تو گھر میں الٹی سیدھی حرکتیں کرنے لگتے ہیں لہٰذا ان کی نفسیات سے واقف ہونا اور ان کی چھوٹی بڑی حرکتوں پر نظر رکھنا نہایت ضروری ہوتا ہے۔ بچے ذہن میں توہمات کا غلبہ بہت جلد ہو جاتا ہے جس سے بچے دھیرے دھیرے ڈرپوک، کمزور اور بزدل ہو جاتا ہے۔ ایسے توہمات کا بچوں کے ذہن سے صاف ہونا بہت ضروری ہے اور ان کے دلوں میں یہ احساس جگانا بھی ضروری ہے کہ خواہ کتنی ہی دقتیں اور رکاوٹیں درپیش ہوں، حق دار کو اس کا حق ضرور ملتا ہے۔

بچوں کے ان ڈراموں کی ایک اہم خصوصیت یہ بھی ہے کہ یہ نہ صرف مطالعے کا ذوق فراہم کرتے ہیں بلکہ یہ سارے ڈرامے اسٹیج کیے جانے کے لائق ہیں۔ ان ڈراموں میں محض پند و نصائح ہی نہیں بلکہ دلچسپ مکالمے بچوں کی توجہ فوراً اپنی جانب مبذول کرا لیتے ہیں۔

امید ہے کہ یہ ڈرامے بچوں کے ذہن و شعور میں وسعت اور نکھار پیدا کرنے میں معاون ثابت ہوں گے۔ قومی اردو کونسل نے بچوں کی تعلیم و تربیت کے لیے جتنی اچھی کتابیں شائع کی ہیں ان میں ''بچوں کے ڈرامے'' بھی ایک بہتر کاوش ہے۔

شب خون (شمارہ 293 تا 299۔ دو جلدوں میں)
مرتبین: شمس الرحمن فاروقی، سید ارشاد حیدر
صفحات: 1984، قیمت: سات سو پچاس روپے
ترسیل زر کا پتہ: 313، رانی منڈی، الہ آباد۔ 211003
خط و کتابت کا پتہ: پوسٹ بکس نمبر 13، الہ آباد۔ 211003
مبصر: تمیزہ رحمانی، نمبر۔ 9، گولہ مارکیٹ، دریا گنج، نئی دہلی۔ 110002

''شب خون'' کو اس اعتبار سے ایک عہد ساز رسالہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ انتالیس برس تک ایک خاص نہج پر نکلتا رہا اور روز اول سے اپنے لیے جو معیار مقرر کیا تھا اس پر آخر تک قائم رہا۔ اس نے جہاں اپنے زمانے کے مشہور و مستند بہت سے پرانے لکھنے والوں کا تعاون حاصل کیا، وہاں بہت سے تازہ واردان بساط ادب کے ذہن و ذوق کی تربیت میں بھی حصہ لیا۔ اردو میں جدیدیت کے رجحان کو منصوبہ بند طریقے سے آگے بڑھانے اور فروغ دینے میں بھی اس کا موثر کردار رہا: اگرچہ اس سے پہلے ماہنامہ ''تحریک'' جس کے مدیر گوپال متل تھے، جدید لکھنے والوں کو ایک پلیٹ فارم مہیا کر چکا تھا۔ ''شب خون'' کا پہلا شمارہ مئی 1966 میں شائع ہوا جب کہ ''تحریک'' اس سے دس بارہ سال پہلے منظر عام پر آ گیا تھا۔ ''شب خون'' کی طرح ''تحریک'' بھی ادب کو سیاست کا تابع مہمل بنانے کے خلاف تھا لیکن دونوں میں ایک واضح فرق بھی رہا۔ ''تحریک نے ادب کے ساتھ ساتھ سیاست میں بھی ادعائیت کے رد میں ایک محاذ کھول رکھا تھا جب کہ ''شب خون'' کا سروکار صرف ادب سے رہا۔ سیاست سے اپنی دوری کے باوجود سیاسی وابستگیاں رکھنے والے اہل قلم کی مخالفت کا ہدف ''شب خون'' بھی بنا۔ اس نے ادبی قدروں کی بحالی پر جو زور دیا اور قلمکاروں کی تخلیقی آزادی کا جس طرح دفاع کیا، اس کے نتیجے میں مخالفین نے اس پر ایک الزام یہ لگایا کہ وہ ادب کی سماجی معنویت کا منکر ہے اور مہملیت کا پرچارک۔ لیکن کچھ دوسرے الزامات کی طرح یہ الزام بھی بے وزن تھا۔ ''شب خون'' کا اپنی اشاعت کے آغاز ہی سے قلمکار اور قاری دونوں کی توجہ حاصل کر لینا اور جلد ہی اپنا وسیع حلقۂ اثر قائم کر لینا، اس پر دلالت کرتا ہے کہ جن ادبی اصولوں اور فنی رویوں کا یہ رسالہ نقیب تھا، ان کی پذیرائی کے لیے نیا ذہن پہلے سے تیار تھا۔

''شب خون'' کا زیر نظر ضخیم شمارہ دو حصوں میں منقسم ہے۔ پہلا حصہ جس میں تازہ موصولہ نگارشات نثر و نظم کو جگہ دی گئی ہے 608 صفحات پر اور دوسرا حصہ جو ''شب خون'' میں شائع شدہ تحریروں کا انتخاب ہے 1376 صفحات پر مشتمل ہے۔ دونوں حصوں میں کچھ اضافی صفحات مشہور خطاطوں کی خطاطی کے نمونوں اور ممتاز آرٹسٹوں (جن میں حنیف رامے بھی ہیں) کی پینٹنگز کے نمونے شامل کیے گئے ہیں۔ ان رنگین صفحات کے لیے آرٹ پیپر استعمال کیا گیا ہے۔ ''شب خون'' کے اس آخری ضخیم شمارے کے دونوں حصے بہت وقیع ہیں۔ خصوصاً دوسرا حصہ جو پچھلی چار دہائیوں کا کم و بیش پورا ادبی منظر نامہ سامنے لے آتا ہے۔ تحقیق، تنقید، فکشن، شاعری، غرض ادب کی مختلف اصناف میں اس مدت میں جو قابل ذکر چیزیں لکھی گئی ہیں، ان میں سے بیشتر یہاں موجود ہیں۔ سید ارشاد حیدر کا یہ دعویٰ غلط نہیں کہ ''اس آخری شمارے کے مطالعے سے گزشتہ چالیس برسوں میں اردو کے معیاری ادب کی رفتار کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔''

سید ارشاد حیدر نے یہ بات بھی زور دے کر کہی ہے کہ انتخاب میں پوری

غیر جانبداری برتی گئی ہے۔ ان کے بیان پر شبہ شک کرنے کی کوئی وجہ نہیں لیکن بعض قلمکاروں کی طرف مرتبین کے ذہنی جھکاؤ کا بھی اندازہ ہوتا ہے، خاص طور پر شعری حصے میں جہاں کچھ شاعروں کی چھ چھ، سات سات یا اس سے بھی زیادہ چیزیں انتخاب میں آگئی ہیں جب کہ باقی شاعروں کی ایک دو چیزیں ہی لی گئی ہیں۔

اس یادگار نمبر کا انتساب محترمہ جمیلہ فاروقی کے نام ہے، ''شب خون'' سے جن کے تعلق خاطر کا اظہار سید ارشاد حیدر نے اپنے اداریے میں ان لفظوں میں کیا ہے ''جمیلہ فاروقی کے بے لوث اور بے دریغ مالی اور اخلاقی تعاون کے بغیر ''شب خون'' بھی خوش درخشید و لے شعلۂ مستعجل بود کا مصداق ہو کر رہ جاتا'' یہ تو آپ اور ہم جانتے ہیں کہ محترمہ جمیلہ فاروقی جناب شمس الرحمن فاروقی کی رفیقۂ حیات ہیں جو اپنے علمی اور ادبی کاموں میں ان کے تعاون کے ہمیشہ معترف رہے ہیں۔

اس ضخیم اور عظیم نمبر میں فاضل مرتبین نے اپنی کوئی نگارش شامل نہیں کی ہے۔ اس کی جو وجہ دی گئی ہے وہ اپنی جگہ لیکن اگر اس میں فاروقی صاحب کی کچھ تحریریں بھی شامل کر لی جاتیں تو نمبر کی قدر و قیمت اور بڑھ جاتی۔

''شب خون'' کا یہ آخری شمارہ ہر ادبی اور ذاتی کتب خانے میں موجود اور محفوظ رہنا چاہیے تاکہ اس سے استفادہ کیا جاتا رہے۔

اردو اور ہندی کے سیاسی ناول (تقابلی مطالعہ)/سورج دیو سنگھ

صفحات: 255، قیمت:-/250 روپے

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، گلی وکیل، کوچہ پنڈت، لال کنواں، دہلی۔6

مبصر: مشرف علی، 1070/5، آر. کے. پورم، نئی دہلی۔110022

اس کتاب میں سیاسی پس منظر میں لکھے گئے اردو اور ہندی کے ناولوں کا تقابلی مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ انسانی زندگی میں خواہ وہ ادب ہو یا معاشرہ، سیاست کی کارفرمائی ہر جگہ بدرجۂ اتم موجود ہے۔ عصر حاضر میں سیاست کا عمل دخل انسانی زندگی کے ہر شعبے میں دیکھا جا سکتا ہے۔ اردو اور ہندی کے ناول نگاروں نے بھی سیاست کی وجہ سے انسانی زندگی میں پیدا ہونے والے حالات و مسائل اور سماج اور معاشرے پر ان کے مثبت و منفی اثرات کی عکاسی ناولوں کے ذریعے کی ہے۔ اردو اور ہندی میں لکھے گئے سیاسی ناولوں کے موضوعات و مسائل، انداز بیان اور کردار نگاری کو خصوصی طور پر مصنف نے اپنی کتاب میں بحث کا موضوع بنایا ہے اور تقابلی مطالعے کے ذریعے دونوں زبانوں میں لکھے گئے متعلقہ ناولوں میں پائی جانے والی مماثلت اور تضاد کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔

یہ کتاب سات ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے باب میں مصنف نے ''سیاسی ناول کا تعارف اور تقابلی مطالعے کی اہمیت'' کے عنوان کے تحت ادب اور سیاست کے رشتے، سیاسی ناول کے معنی و مفہوم اور ادب میں تقابلی مطالعے کی اہمیت کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کے علاوہ موضوعات کے لحاظ سے اردو اور ہندی ناولوں کو سماجی، معاشرتی، سیاسی، تاریخی، نفسیاتی، طنزیہ و مزاحیہ اور جاسوسی ناول کے خانوں میں تقسیم کیا ہے تاکہ واضح طور پر سیاسی ناول کی تعریف پیش کی جا سکے۔

دوسرے باب کا عنوان ''اردو اور ہندی کے سیاسی ناول: ایک مختصر جائزہ'' ہے جس میں اردو اور ہندی کے سیاسی اور نیم سیاسی ناولوں کا تجزیاتی مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ ابتدا سے حال تک دونوں زبانوں کے سیاسی ناولوں کو آزادی سے قبل اور آزادی کے بعد کے حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے اور ان ناولوں کے موضوعات و مسائل، پلاٹ اور کردار کا تجزیاتی مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔

تیسرا باب ''فسادات کے مسائل اور اردو ہندی ناول'' پر مشتمل ہے جس میں کرشن چندر کے ''غدار'' اور بھیشم ساہنی کے ''تمس'' کا تقابلی مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ یہ دونوں ناول تقسیم ہند کے بعد ہونے والے فرقہ وارانہ فسادات، قتل و غارت گری کے پس منظر کی عکاسی کرتے ہیں۔ برطانوی حکومت کی پالیسی ''پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو'' نے ہندو مسلم فرقہ وارانہ ہم آہنگی کو سب سے زیادہ نقصان پہنچایا اور یہیں سے ہندوستان میں دو قومی نظریے کی بنیاد پڑی جس کا فائدہ مفاد پرست سیاسی اور مذہبی رہنماؤں نے اقتدار کی ہوس میں ہندو مسلم فرقہ وارانہ فسادات کو ہوا دے کر بخوبی اٹھایا اور آخر کار نتیجے کے طور پر برصغیر کی تاریخ میں تقسیم ہند کا المناک واقعہ پیش آیا۔ تقسیم ہند نے متعدد مسائل پیدا کیے جو آج تک بدستور قائم ہیں۔

کرشن چندر نے ''غدار'' میں جہاں ہندو مسلم فسادات کے پس پردہ جو مفاد پرست ذہنیت کام کر رہی تھی، اس کی عکاسی کی ہے وہیں بھیشم ساہنی نے ''تمس'' میں فسادات کے مسائل اور اس کے پیچھے کام کرنے والی ذہنیت کو اجاگر کیا ہے۔

چوتھے باب میں خدیجہ مستور کے ناول ''آنگن'' اور راہی معصوم رضا کے ناول ''آدھا گاؤں'' کا تقابلی مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ 15 اگست 1947 کو ہندوستان برطانوی سامراج کے شکنجے سے آزاد تو ہوا لیکن آزادی کے ساتھ اس کے جلو میں تقسیم ہند کا سانحہ بھی آیا۔ ''آنگن'' اور ''آدھا گاؤں'' دونوں ناولوں کا موضوع تحریک آزادی اور تقسیم ہند سے متعلق ہے۔ دونوں ناولوں میں اس عہد کی تہذیب و ثقافت، سماج کی بدلتی ہوئی قدروں اور سیاسی صورت حال پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ خدیجہ مستور نے جہاں ایک ہی آنگن میں رہنے والے ایک ہی گھر کے افراد جو مختلف سیاسی نظریات کے حامی ہیں، کے ذریعے قومی سیاست کے نشیب و فراز اور بدلتے ہوئے حالات و مسائل کا جائزہ پیش کیا ہے، وہیں راہی معصوم رضا نے ''آدھا گاؤں'' میں ایک گاؤں

کے حالات ومسائل کو موضوع بنا کر قومی سیاست اور سیاسی اور سماجی سطح پر موجود چالبازیوں اور ان کے نتائج اور بدلتی ہوئی عصری قدروں کو اجاگر کیا ہے۔

پانچویں باب ''سیاسی بدنظمی اور اردو، ہندی ناول'' میں کرشن چندر کے ناول ''ایک گدھے کی سرگزشت'' اور شرون کمار گوسوامی کے ناول ''جنگل تنتر م'' کا تقابلی مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ دونوں ناولوں میں فنتاسیائی اور تصوراتی پیش کش اور طنز و مزاح کے ذریعے سیاسی اور سماجی بدنظمی، افسر شاہی اور دفتری نظام میں موجود بدعنوانی اور رشوت خوری کی تصویر کشی کی گئی ہے۔

چھٹا باب ''ہنگامی صورتحال اور اردو، ہندی ناول'' انور سجاد کے ناول ''خوشیوں کا باغ'' اور نرمل ورما کے ناول ''رات کا رپورٹر'' کے تقابلی مطالعے پر مشتمل ہے۔ یہ دونوں ناول ایمرجنسی اور مارشل لا کے پس منظر میں تحریر کیے گئے ہیں۔ ''خوشیوں کا باغ'' کا پس منظر قیام پاکستان کے بعد وہاں وجود میں آنے والا سماجی، سیاسی اور معاشرتی نظام ہے جس میں ریاستی تشدد، بربریت اور ظلم وستم کا بازار گرم ہے۔ اس ناول میں ایک فرد کے ذہنی کرب کے ذریعے حالات و مسائل کی عکاسی کی گئی ہے۔ جب کہ ''رات کا رپورٹر'' میں ایمرجنسی سے پیدا شدہ صورت حال میں عام انسان کی روز مرہ زندگی میں آنے والی پریشانیوں کو موضوع بنایا گیا ہے۔ اس ناول میں ایک ایسے صحافی کی کہانی پیش کی گئی ہے جس کی داخلی زندگی کی پریشانیوں کا سبب خارجی حالات ہیں۔

ساتویں اور آخری باب ''کسان مزدور تحریک اور اردو، ہندی ناول'' میں جیلانی بانو کے ''بارش سنگ'' اور متو بھنڈاری کے ''مہا بھوج'' کا تقابلی مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ ''بارش سنگ'' تلنگانہ کسان تحریک کے پس منظر میں تخلیق کیا گیا ہے جس میں آزادی سے قبل اور آزادی کے چند برسوں بعد تک حیدر آباد کے دیہی علاقوں میں رہنے والے غریب کسانوں، مزدوروں اور عورتوں کی زندگی اور ان کےمسائل کو موضوع بنایا گیا ہے۔ جاگردارانہ نظام کا ظلم وستم، معاشی استحصال، طبقاتی کشمکش اور سیاسی اور مذہبی رہنماؤں کی عیاریوں و مکاریوں کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ جب کہ ''مہا بھوج'' میں شمالی ہند کے مزدوروں کے مسائل کو سماجی اور سیاسی تناظر میں پیش کیا گیا ہے اور اس ناول کے ذریعے سیاست میں موجود بدعنوانیوں، چالبازیوں اور مکاریوں کو موضوع بنایا گیا ہے۔ یہ دونوں ناول سیاسی اور سماجی حقیقت نگاری کی عمدہ مثال پیش کرتے ہیں۔ مصنف نے دونوں ناولوں کے موضوعات، انداز بیان اور کردار نگاری پر تفصیلی بحث کی ہے۔

مجموعی طور پر یہ کتاب اردو اور ہندی کے سیاسی ناولوں کے تقابلی مطالعے کی سمت میں ایک اہم پیش رفت ہے۔ امید ہے کہ اس کتاب کو قارئین کی پذیرائی حاصل ہوگی۔

راہ چلتے مسافر/ جبار راجن پردیسی
صفحات: 150، قیمت: -/100 روپے
ناشر: ''امن'' گاندھی گلی، اترولی، علی گڑھ۔ 202280 (یو.پی.)
مبصر: مسعود حسین خاں، جاوید منزل، جامعہ اردو روڈ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔ (یوپی) 202002

جبار راجن اپنے فن (طب) پر دسترس رکھتے ہوئے افسانہ نگاری کے فن میں بھی کمال رکھتے ہیں۔ عرصے سے مختلف رسائل میں ان کی نگارشات شائع ہو رہی ہیں اور ''راہ چلتے مسافر'' ان کے مختصر افسانوں کا مجموعہ ہے۔ ان کے افسانوں کا محور کوئی ایک چھوٹا سا واقعہ ہوتا ہے لیکن اس کے بیان کرنے میں جو ڈرامائی کیفیت ملتی ہے وہ چونکا دیتی ہے۔ وہ مختصر گوئی کے فن سے بخوبی واقف ہیں اسی لیے ان کا کوئی افسانہ پانچ چھ صفحات سے زیادہ پھیلا ہوا نہیں ہے۔ اس مختصر گوئی کے فن سے جہاں انھوں نے بے انتہا دلچسپ ڈرامائی انداز پیدا کرلیا ہے وہیں وہ بعض اوقات ''کہانی'' پن سے انصاف نہیں کر پاتے۔ نتیجتاً وہ پند وموعظت شروع کر دیتے ہیں۔ کاش وہ فن اور وعظ کے درمیان کے خطِ فاصل کو ہمیشہ ملحوظ رکھ سکتے۔ مسلّم کہ وہ ایک شدید محب وطن اور انسانیت شناس ادیب ہیں لیکن ان اقدار کو بروئے کار لانے کے لیے جس نزاکت فن کی ضرورت ہوتی ہے وہ مار کھا جاتی ہے۔ اصلاحی اور وطن دوستی کی افسانہ نگاری کے نقطۂ نظر سے وہ پریم چند کے سچے چیلے ہیں۔ ان کی کہانیاں واقعات پر مبنی ہوتی ہیں۔ خاص طور پر عورت کے دل کی دھڑکن کو خاص طور پر محسوس کرتے ہیں۔ عورت بحیثیت ماں، بیوی اور بیٹی ان کے پیش نظر رہتی ہے۔ وہ ان بدنصیبوں کے بھی راز دار ہیں جن کا ''کوٹھیوں'' یا ''کوٹھوں'' میں استحصال ہوتا ہے۔ ان کے بعض اچھے افسانوں کا محور ''عورت'' ہے۔

میں ان کی انسان دوستی، حب الوطنی اور سیکولرزم کی قدر کرتا ہوں۔ خدا کرے وہ فن اور حکمت کے سنگم کو اپنی آئندہ تخلیقات میں اور اجاگر کرتے رہیں۔

خواب سا کچھ/ عرفان احمد
صفحات: 160، قیمت: 125 روپے
ملنے کا پتہ: 2818، ذاکر نگر، اوکھلا، نئی دہلی۔ 110025
مبصر: مولا بخش، شعبۂ اردو، دیال سنگھ کالج، دہلی یونیورسٹی۔ دہلی۔ 110007

عرفان احمد جدید تر غزل سے وابستہ ایک ایسے شاعر ہیں جنھوں نے اپنی غزلوں میں اپنے عہد کے المیوں کو شعری پیکر عطا کیا ہے۔ ان کی شاعری بظاہر روز مرہ اور بول چال سے بہت قریب ہے لیکن انھوں نے کسی حد تک اپنی زبان کو روز مرہ کے باسی پن سے دور بھی رکھا ہے اور بعض مقامات پر استعارہ سازی کی قابل ذکر مثالیں بھی فراہم کی ہیں:

چلو بھلا ہوا دن جلد ہی نکل آیا
میں نقش دوستی میں رنگ بھر رہا تھا بہت

''چلو بھلا ہوا'' یہ فقرہ روز مرہ کی شان ہے لیکن اسے جوڑا گیا ہے مصرعے کے آدھے یونٹ یعنی، دن جلد ہی نکل آیا ہے۔ یہ یونٹ مکمل استعاراتی ہے۔ اس سے مراد ہے حقائق کا روشن ہو جانا۔ دوسری جہت یہ ہے کہ بھرم، امید، اعتبار ایک پرسکون رات کی طرح ہیں۔ دوسرے مصرع میں ''نقش دوستی'' کی بجائے ''اپنی دوستی'' بھی لکھا جا سکتا تھا لیکن ''نقش دوستی'' کہہ کر دوستی کے قائم ہونے سے لے کر اس وقت تک کے مرحلے کی عکاسی کردی گئی ہے کہ جب عاشق کو یہ دوستی پرفریب نظر آنے لگتی ہے۔ ''رنگ بھرنا'' جیسے محاورے کا محل استعمال بھی خوب ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ عاشق کو اس کی شدید فکر تھی کہ وہ اپنی دوستی کو مثالی بنادے لیکن دن کی رعایت سے رنگ بھرنے کا محاورہ اس امر کا اشارہ بن جاتا ہے کیونکہ ایک مصوّر اچانک تیز روشنی میں اپنی تصویر میں رنگ بھرنے کے سلسلے میں دقتیں محسوس کرنے لگتا ہے اور اپنے کام کو انحصار رکھتا ہے کہ رنگ بھرنے کے لیے ایک خاص حد تک ہی روشنی کی ضرورت ہوتی ہے۔

متوسط طبقے کے لوگوں میں آئے دن کے نت نئے اخراجات کو لے کر کتنی پریشانیاں کھڑی ہوتی رہتی ہیں، چھوٹے موٹے کام کر کے اپنا گھر چلانے والے لوگ کس طرح ایک ایک پیسہ بچا کر رکھتے ہیں۔ تھوڑے سے پیسے کس طرح بار بار گنے جاتے ہیں، رکھے جاتے ہیں، اس مضمون کو مندرجۂ ذیل شعر میں محض حساب سا کچھ جیسے فقرے سے ظاہر کردیا گیا ہے:

وہ پھول ہاتھوں میں سنگ پارے
وہ ایک پیسہ حساب سا کچھ

تاریخ کا جبر ماضی کا کرب، بے کاری، بے روزگاری اور غم جاناں کا دکھ آج کی نسل خصوصاً ان علاقوں کے نوجوانوں کے لیے ایک مسئلہ جانکاہ بن چکا ہے جہاں زندگی حویلیوں کی چکا چوندھ میں اٹھکھیلیاں کرتی تھی۔ وہی لوگ جب آج در بدر بھٹکتے ہیں، قدروں کی شکست کا منظر دیکھتے ہیں تو ان کے دل میں ایک ہول سا اٹھتا ہے:

یاد ماضی، عشق، غم، مجبوریاں، فکر معاش
زخم خوردہ ایک دل کتنی بلاؤں کا شکار

یاد ماضی، تاریخ، عشق، غم، مجبوریاں، فکر معاش کس حد تک مناسبات لفظی کی مثالیں ہیں، بلائیں کہہ کر شاعر نے اس عہد کے نوجوانوں کے مسائل کا اظہار بڑی خوبصورتی سے کردیا ہے۔ عرفان احمد کی غزلوں میں بلیغ قسم کا رومان اور عشقیہ واردات کے مضامین ملتے ہیں:

زہر تنہائی شب بے منزلی دشت فراق
جی میں آتا ہے کہ خاک رہ گزر ہو جایئے

غالب نے کہا تھا:

دائم پڑا ہوا ترے در پر نہیں ہوں میں
خاک ایسی زندگی پہ کہ پتھر نہیں ہوں میں

یہاں غالب اور عرفان احمد کا تقابلی مطالعہ مقصود نہیں۔ یہ بتانا ہے کہ غزل ایک طرح سے Genetic Duplication کی شاعری ہے کہ جس میں اپنی جگہ بنانا بہت مشکل ہے، پرانے مضامین کو باندھنے کا اگر نیا سلیقہ نہ ہو تو شاعر کی عاقبت خراب ہو جاتی ہے۔ عرفان احمد کس حد تک مذکورہ بالا شعر میں اپنی عاقبت بچاتے نظر آتے ہیں۔ مذکورہ شعر میں عاشق کی یہ تمنا ہے کہ دشت فراق، شب بے منزلی اور زہر تنہائی سے نجات ملے یعنی خدا اسے خاک رہ گزر بنا دے۔ غالب کے شعر میں جو عاشق کا کردار ہے وہ محبوب کی چوکھٹ میں ایک پتھر کی طرح پڑے رہنا چاہتا ہے یعنی عاشق چاہتا ہے کہ پتھر اگر وہ ہو جاتا تو کم از کم آتے جاتے محبوب کا دیدار تو ہو جاتا۔ عرفان کے شعر میں جو عاشق کا کردار ہے وہ بھی خاک رہ گذر شاید اسی لیے بننا چاہتا ہے کہ محبوب کا گذر اگر اس راستے سے ہو تو کم از کم دیدار تو ہوتا رہے۔ اس معنی کے علاوہ ایک پہلو یہ بھی ہے کہ عاشق عشق میں اس مقام پر پہنچا ہوا ہے جہاں سے وہ جدائی میں گھٹ گھٹ کر مرنے کی بجائے خود کو محبوب کے پیروں کی گرد دینا چاہتا ہے' بنا فی زمانہ' غزلوں کے مجموعوں پر نگاہ ڈالیے تو صفحے کے صفحے پلٹتے جایئے کوئی شعر آپ کے دامن دل سے لپٹتا نظر نہیں آتا لیکن ''خواب سا کچھ'' کی غزلوں میں بہت سے مقامات پر قاری ضرور ٹھہرے گا اور اشعار پر غور و فکر کرے گا۔

عرفان احمد کا شعری سفر ابھی جاری ہے۔ انھوں نے غزل کے مزاج اور اس کی فطرت سے اعراض نہیں کیا تو کامیاب شاعر بن کر ضرور ابھریں گے اگر اس کی شعریات کی تہوں میں اترنے کی بجائے انھوں نے زمانے کے ہنگاموں کو شعر میں ڈھالنا شروع کیا تو ممکن ہے ان کی شاعری بھی مجموعہ ہائے غزل میں کہیں دب کر دم توڑ دے لیکن میں ایک قاری کی حیثیت سے یہ امید کرتا ہوں کہ جو شاعر یہ کہہ سکتا ہو کہ زندگی کا مشغلہ یا جینے کی ہیئت ہیئت اجتماعی ہے، کسی فرد واحد کی کامیابی کوئی معنی نہیں رکھتی۔ اس شاعر کے شعری مجموعے کی معنویت رنگ ضرور لائے گی۔

اکیلے پار اتر کے بہت ہے رنج مجھے
میں اس کا بوجھ اٹھا کر بھی تیر سکتا تھا

مذکورہ بالا شعر یہ اشارہ کررہا ہے کہ اس کا خالق ایک خاص فکری نظام کے زیر اثر غزلیہ متن کی تشکیل میں یقین رکھتا ہے جو فی زمانہ کمیاب ہے۔

□□□

مصنف: محمد قاسم صدیقی

بچوں کا گوشہ

زندگی کو سمجھنے اور اسے بہتر بنانے میں اچھا ادب معاون ہوتا ہے، ساتھ ہی اپنے پڑھنے والوں کو یہ ذہنی تفریح بھی بہم پہنچاتا ہے۔ بڑوں کی طرح بچوں کا بھی یہ حق ہے کہ ان کی ذہنی ضرورتوں کے مطابق انہیں اچھا ادب فراہم کیا جائے جو سبق آموز ہونے کے ساتھ ساتھ دلچسپ بھی ہو تاکہ بچے خوشی خوشی اس کا مطالعہ کریں۔ قومی اردو کونسل نے بچوں کے لیے بڑی تعداد میں ایسی کتابیں شائع کی ہیں جو اس معیار پر پوری اترتی ہیں۔

ذیل میں قومی اردو کونسل کی شائع کردہ کتاب "بھارت کی لوک کتھائیں" (حصہ دوم) سے ایک کہانی پیش کی جا رہی ہے۔ہندوستان قصے کہانیوں کا ملک ہے۔ دیو مالائی اور ما فوق الفطرت کہانیاں جتنی ہمارے پاس ہیں، شاید ہی کسی اور ملک میں ہوں۔ "بھارت کی لوک کتھائیں" میں باون (52) دلچسپ کہانیاں پیش کی گئی ہیں جو بچوں کے ساتھ بڑوں کو بھی پسند آئیں گی۔ چند کہانیوں کے عنوانات یہ ہیں: بلی اور گدھ،بندر اور ریچھ، لومڑی کا انصاف، کچھوا اور تالاب، مور کے خوبصورت پر، بلبل اور ہاتھی،چالاک گیدڑ، برائی کا انجام برا، سانپ اور مینڈک ، شیر اور کسان وغیرہ۔تین حصوں پر مشتمل 236 صفحات کی اس کتاب کی قیمت -/46 روپئے ہے۔ کونسل نے اس کا تیسرا ایڈیشن حالی ہی میں شائع کیا ہے۔ قومی اردو کونسل اپنی مطبوعات پر طلبہ اور اساتذہ کو 40فیصد کی خصوصی رعایت دیتی ہے۔

جانوروں کی سرکار

اب سے بہت سال پہلے میسور کے قریب ایک گاؤں میں ایک فقیر رہتا تھا۔ وہ ہر وقت خدا کی عبادت کرتا اور اپنے مذہب کے اصولوں پر چلتا تھا۔ یہ فقیر جانوروں کو پالتا اور ان کو ادھر ادھر لے جا کر بیچا کرتا تھا۔ اس طرح سے جو پیسے بچتے ان سے وہ اپنے گھر کا خرچ چلاتا۔

ایک بار اس کے پاس صرف ایک گدھا، ایک بندر اور ایک بکرا باقی رہ گئے تھے۔ وہ انھیں بیچنے کے لیے جانے والا تھا۔ گرمیوں کا زمانہ تھا۔ اس نے ان جانوروں کو گھر کے آنگن میں باندھا اور خود ایک چٹائی بچھا کر خدا سے دعا مانگنے لگا۔ جب رات زیادہ ہوگئی تو جانور آپس میں باتیں کرنے لگے۔ گدھے نے کہا" آج کا دن بہت اچھا ہے، ہمارا مالک خدا سے دعا مانگ رہا ہے۔ ہم بھی اس زندگی سے تنگ آگئے ہیں کیوں نہ ہم بھی دعا مانگیں۔ شاید ہماری دعا بھی قبول ہو جائے۔"

تینوں جانور فوراً اس بات پر تیار ہو گئے۔ کچھ دیر تک تینوں آسمان کی طرف دیکھتے رہے اور اس کے بعد اپنی اپنی بولی میں کچھ بولنے لگے۔

فقیر جاگ رہا تھا۔ وہ ان جانوروں کی بولی سمجھتا تھا۔ اس نے جب ان جانوروں کو خدا سے دعا مانگتے سنا تو ان سے بولا" بتاؤ تم نے خدا سے کیا کیا دعائیں مانگی ہیں۔"

گدھے نے کہا" میں نے خدا سے یہ دعا مانگی ہے کہ مجھے اس ملک کا بادشاہ بنا دے۔"

بکرا بولا!" میں نے تو اللہ سے یہ دعا مانگی ہے کہ میں فوج کا سپہ سالار بن جاؤں۔"

بندر دونوں کی باتیں سنتا رہا اور اپنا سر ہلا کر بولا۔" خوب تم لوگوں نے خوب دعائیں مانگیں، میں نے تو یہی کہا کہ بس میں تو اس ملک کا قاضی بن جاؤں تاکہ سب کے مقدمے میرے ہی پاس آئیں۔"

فقیر حیران رہ گیا، وہ سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ یہ جانور دعائیں مانگیں گے۔ اس نے سوچا کہ دعا کے پورا ہونے کا ایک وقت ہے، ایسا نہ ہو کہ ان کی دعا قبول ہو جائے۔ اس لیے اس نے آسمان کی طرف منہ کر کے کہا۔

" اے خدا تو میرے اوپر اپنا کرم کرنا۔ مجھے تو اندھا کر دینا تاکہ میں ایسی سرکار نہ دیکھ سکوں۔"

□□□

افتخار الزماں

جواہر لال نہرو کے یوم ولادت کے موقعے پر

جواہر لال نہرو اور بچے

ہندوستان کی تاریخ متعدد ایسی ہستیوں کے کارناموں سے بھری پڑی ہے جو اپنی فکر اور بیش بہا کارناموں کے باعث زمانہ ساز اور تاریخ ساز کی حیثیت رکھتی ہیں۔ پنڈت جواہر لال نہرو کا شمار ایسی ہی چند عظیم ہستیوں میں کیا جاتا ہے۔ وہ ایک ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے۔ وہ بیک وقت قانون داں، سیاست داں، مجاہد آزادی، دانشور، ادیب اور مدبر تھے۔ ان سب خوبیوں کے ساتھ ساتھ ان کی جو سب سے بڑی خوبی تھی وہ ایک عظیم رہنما کی تھی۔ وہ جتنے عظیم رہنما تھے، اتنے ہی عظیم انسان بھی۔

پنڈت جواہر لال نہرو بچوں کو بہت پیار کرتے تھے۔ بچوں کے ساتھ ان کا فطری لگاؤ تھا اور بچے بھی ان کو ''چاچا نہرو'' کہہ کر پکارتے تھے۔ بچوں کے ساتھ ان کے گہرے لگاؤ کی وجہ سے ہی ہر سال ان کے یوم پیدائش یعنی 14 نومبر کو ''چلڈرنس ڈے'' یعنی ''یوم اطفال'' کے طور پر منایا جاتا ہے۔ پنڈت نہرو بچوں کو مستقبل کے رہنما اور ملک کے اعلیٰ منصب پر دیکھنا چاہتے تھے۔ ان کے مطابق بچے ہی مستقبل کے معمار ہیں۔ ان کا ذہن جتنا بہتر ہوگا وہ اتنا ہی اعلیٰ منصب کی ذمہ داریوں کو بحسن وخوبی انجام دے سکے گا۔ ان کے سامنے بچوں کی تربیت ہی قوم کی اصل دولت ہے۔ بچے قوم کی امانت ہیں اور قوم کی ترقی کا دارومدار ان پر ہے۔

بچوں کے تئیں ان کے خلوص کا جو جذبہ تھا اس کو سمجھنے کے لیے سب سے پہلے جواہر لال نہرو کی ذاتی زندگی اور جس ماحول میں وہ پلے بڑھے اس کو بھی سمجھنا ضروری ہے۔ اس طرح پنڈت جواہر لال نہرو کی زندگی کو دو مخصوص ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلے دور میں وہ وطن عزیز کی آزادی کے لیے سرگرداں عوام کے ہر دل عزیز رہنما کی حیثیت رکھتے ہیں اور اس دور میں وہ گاندھی جی کی شخصیت سے بھی بہت متاثر ہوتے ہیں اور نظریاتی اختلافات کے باوجود گاندھی جی کے بے حد قریب رہے۔ دوسرا دور آزادی کے بعد شروع ہوتا ہے۔ جب انھوں نے ملک کے پہلے وزیر اعظم کی حیثیت سے ہندوستان کی تعمیر کا کام شروع کیا۔

بچوں کے ساتھ ان کی شفقت و محبت کا جذبہ ایسا تھا کہ بچوں میں وہ بچہ بن جایا کرتے تھے۔ ان کی خوشی میں خوش ہوتے اور ان کی تکلیف میں بے چین اور اداس ہو جایا کرتے تھے اور فوراً انھیں خوش کرنے کی تدبیر ڈھونڈنے لگتے۔

ایسا ہی ایک واقعہ ان کے رفیق کار بیان کرتے ہیں کہ ایک بار پنڈت جواہر لال نہرو قیام کے لیے آنند بھون (الہ آباد) تشریف لائے تھے۔ شہر کی معزز شخصیتیں ملنے کی غرض سے تشریف فرما تھیں۔ نہرو جی ایک دلکش مسکراہٹ کے ساتھ ڈائننگ ہال میں تشریف لائے اور سبھی لوگوں سے خوش دلی سے مصافحہ کیا اور کھڑے ہو کر اپنی شیروانی پر سجے گلاب کے پھول کو درست کرنے لگے کہ اچانک ان کی نگاہ برآمدے میں کھڑے بچوں کی جماعت پر پڑی اور وہ چپ چاپ کھڑے ہی رہ گئے۔ انھیں کھڑا دیکھ کر موجود معزز حضرات بھی سنبھل کر کھڑے ہو گئے۔ مگر نہرو جی ان لوگوں سے گفتگو کرنے کی بجائے ان بچوں کی طرف بڑھ گئے اور پوچھا: ''کیسے ہو تم لوگ؟''

بچوں نے مسکراتے ہوئے کہا: ''پنڈت جی، سب ٹھیک ہے۔''

انھوں نے پھر پوچھا: ''کوئی پریشانی؟''

تمام بچے خاموشی سے ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔ نہرو جی نے بڑے پیار سے کہا: ''آؤ تم لوگ میرے ساتھ آؤ اور بتاؤ کیا بات ہے۔'' ان بچوں نے بولنا شروع کیا: ''پنڈت جی بارش کے دنوں میں ہم لوگ اسکول سے گھر واپس آتے ہیں تو ہماری کتابیں بھیگ جاتی ہیں اور ہم لوگ بھی بھیگ جاتے ہیں۔'' پنڈت جی نے بڑی شفقت سے ان کی باتیں سنیں اور کہا: ''واقعی ایسا ہی ہوتا ہے۔'' بچے پنڈت جی کی جے کا نعرہ لگاتے ہوئے واپس ہو گئے مگر پنڈت جی نے دہلی پہنچ کر اسی دن ایک آدمی کو بازار بھیج کر ان بچوں کے لیے برساتی منگوائی اور الہ آباد کے ان اسکولی بچوں کے لیے بھیج دیا۔

جواہر لال نہرو کے مطابق ''موجودہ دور کے بہترین ذہن کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ علمی اور افادی، اخلاقی اور معاشرتی اقدار، ایثار، ہمدردی اور خدمت کے جذبے سے معمور ہوتا ہے۔ اس کی سماجی اصلاح وترقی کے جوش نے ایک علمی تصوریت کی شکل اختیار کر لی ہے— انسانیت اس کا دیوتا ہے اور سماج اس کا مذہب۔''

پنڈت نہرو اپنے قول اور اپنی اعلیٰ سوجھ بوجھ کو بروئے کار لاتے ہوئے ہندوستان کو مضبوط بنیادوں پر کھڑا کرنے میں معاون ثابت ہوئے۔ اس لحاظ سے اگر پنڈت نہرو کو نئے ہندوستان کا معمار کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ دراصل پنڈت جی کی شخصیت اور ان کی فکر کی تشکیل میں تاریخی شعور کا بہت

دخل تھا۔ حالاں کہ انھوں نے تاریخ کا مطالعہ باقاعدہ طور پر نہیں کیا تھا۔ وہ سائنس اور قانون کے طالب علم تھے لیکن دوران تعلیم انگلینڈ میں کیمبرج یونیورسٹی کے ماحول میں انھیں سماجی علوم، معاشیات اور تاریخ سے زیادہ شغف پیدا ہو گیا تھا۔ انھوں نے جدید مفکرین اور مورخین کا بڑی دلچسپی کے ساتھ گہرائی سے مطالعہ کیا تھا۔ دنیا کی انقلابی تحریکوں کے علاوہ ہندوستان کی آزادی کی جدوجہد کے نشیب و فراز سے بھی اچھی طرح واقف تھے۔

جواہر لال نہرو کا بچپن جس خاندانی ماحول میں گزرا، وہ مذہبی تربیت کے لیے خاص طور پر ناسازگار تھا۔ وہ لوگ مذہبی معاملے میں بے پروائی برتتے تھے جس کا اثر بچوں کے مذہبی احساس کی نشوونما پر پڑنا فطری تھا۔ جواہر لال نہرو اپنی کتاب ''میری کہانی'' میں ایک جگہ رقم طراز ہیں کہ مذہب کا میرے دل میں محض ایک دھندلا سا تصور تھا۔ میں اسے عورتوں کا معاملہ سمجھتا تھا۔ والد اور میرے چچازاد بھائی مذہبی امور کو کوئی اہمیت نہیں دیتے تھے اور ہنسی میں ٹال دیا کرتے تھے۔ مگر مذہب کی چنگاری جواہر لال نہرو کے دل کے کسی کونے میں ضرور دبی ہوئی تھی۔ جو گیارہ برس کی عمر میں ایک آئرش اتالیق ف۔ٹ۔ بروکس کے ساتھ سے دہک اٹھی۔ بروکس تھیوسوفی کے نئے مذہب کے بڑے معتقد تھے اور ان کے یہاں ہر ہفتے تھیوسوفیوں کی مجلس منعقد ہوا کرتی تھی۔ کم سن جواہر لال نہرو پر ان مجلسوں میں شرکت کرنے کا بڑا گہرا اثر پڑا۔

جواہر لال نہرو کے جد امجد کشمیر سے ہجرت کر کے آئے تھے اور جدید تعلیم سے روشناس تھے، لیکن مختلف وجوہات کی بنا پر یہ خاندان پہلے دہلی سے آگرہ اور پھر الہٰ آباد منتقل ہو گیا۔ جواہر لال نہرو کی پیدائش الہٰ آباد میں 14 نومبر 1889 کو ہوئی۔ اس وقت ان کے والد موتی لال نہرو کا شمار ملک کے بڑے وکیلوں میں ہوتا تھا۔ ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی اور مزید تعلیم حاصل کرنے کے لیے 1905 میں انھیں انگلستان بھیج دیا گیا۔ چند ہی مہینے میں انھوں نے انگلستان کی سیاست سے اتنی واقفیت حاصل کر لی جو ان کے استادوں کے نزدیک حیرت انگیز تھی۔

کیمبرج کی تعلیم ختم کرنے اور سائنس کی سند لینے کے بعد جب جواہر لال نہرو کو بیرسٹری کے امتحان کی تیاری کے لیے دو برس لندن میں قیام کرنا پڑا تو سیاست سے ان کی دلچسپی اور بڑھ گئی۔ آخر میں کیمبرج سے بیرسٹری کی ڈگری لے کر 1912 میں ہندوستان لوٹے اور الہٰ آباد ہائی کورٹ میں وکالت شروع کر دی لیکن ان کے دل میں قومی آزادی کی جو لگن تھی وہ چین نہیں لینے دیتی تھی۔ انھوں نے اپنا خاندانی پیشہ چھوڑ دیا اور اپنی عملی زندگی کا آغاز ہندوستان کی جنگ آزادی کے پرجوش سپاہی کی حیثیت سے کیا۔

پنڈت نہرو نے آزادی کی لڑائی میں جس دانش مندی، استقلال اور استقامت کا ثبوت دیا اور جو قربانیاں پیش کیں ان کی مثال مشکل سے ملے گی۔ اپنی شریک حیات کے علاج کے سلسلے میں بار بار یورپ کا سفر کرنے کے دوران انھوں نے مختلف ممالک کے ادیبوں، فنکاروں، رہنماؤں اور دانشوروں سے ملاقاتیں بھی کیں اور عالمی سطح پر رونما ہونے والے انقلابات و تغیرات سے واقف ہوئے۔ اس سے ان کی نظر میں گہرائی اور گیرائی پیدا ہوئی۔ انھوں نے نہ صرف اپنے ملک کے لیے بلکہ پوری نوع انسانی کی ترقی کے لیے ایک خاکہ بنایا جس کا بوجھ ان نونہالانِ قوم کے کندھوں پر ڈالنا چاہا جو مستقبل کے سچے خادم کے طور پر دنیا کے نقشے پر ابھرنے والے تھے۔ پنڈت نہرو کا حساس دل بچوں کے لیے بھر آتا تھا۔ وہ اپنے عمل کے ذریعے بچوں کو مستقبل کا قائد بننے کے لیے تیار کر رہے تھے۔ پنڈت نہرو کا اپنی پیاری بیٹی پریہ درشنی اندرا کے نام جیل سے خط لکھنا بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی تھی۔ نہرو تمام عالم میں بچوں کے ذریعہ امن و آشتی کا پیغام پہنچانا چاہتے تھے۔ انھوں نے بچوں کی کمزوریوں کو طاقت بنا کر قوم کے سامنے پیش کرنے کی کوشش کی۔ کیوں کہ وہ اس بات پر یقین رکھتے تھے کہ بغیر سماجی آزادی اور حکومت و معاشرت کی تنظیم کے، فرد خاطر خواہ ترقی نہیں کر سکتا۔

دراصل جواہر لال نہرو ایک ایسے معاشرے کا خواب دیکھ رہے تھے جس میں طبقوں کا فرق مٹ جائے۔ معاشی معاملات میں سب کے ساتھ یکساں انصاف برتا جائے اور سب کو یکساں موقع دیا جائے۔ ایک منظم سماج جس کا یہ مقصد ہو کہ بنی نوع انسان بلند مادی اور تمدنی سطح پر پہنچ سکے۔ پنڈت نہرو مادیت کو اہمیت تو دیتے تھے مگر وہ زندگی کے ثقافتی پہلو کو نظر انداز نہیں کرتے تھے۔ ان کے نزدیک انسانی سماج، تہذیب و تمدن کا ایک ایسا گہوارہ ہے، جس میں فن و ادب، علم و فلسفہ، سائنس کی ایجادات، قانون، موسیقی، باہمی تعاون یعنی انسانی مشاغل کے سارے دھارے آکر ملتے ہیں۔ وہ اعلیٰ قدروں کے حصول ہی کو انسان کا مقصد اعلیٰ مانتے تھے اور خدمت خلق کو مذہب کا درجہ دیتے تھے۔ ان کے نزدیک بچوں کی خدمت، خدمتِ خلق سے کم درجہ نہیں رکھتی تھی۔ ان کی اسی فکر کا نتیجہ ہے کہ وہ بچوں میں اپنا اعلیٰ مقام بنانے میں کامیاب ہوئے۔ ان کے نزدیک بچے ہی قوم کی ترقی کا ضامن بن سکتے ہیں۔ اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب بچوں کے اندر حوصلہ ہو، کچھ کرنے کی تمنا ہو۔ وہ بچوں کو قوم کے جدید معمار کے طور پر یاد کرتے تھے۔

انھوں نے ہندوستان کی جنگ آزادی کو عالمی پیمانے پر نوآبادیات کی آزادی کی تحریک کا حصہ بنایا اور ہندوستان کی آزادی کے ساتھ ساتھ ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکہ کے ممالک کی آزادی کے لیے بھی جدوجہد شروع کی۔ نئے ہندوستان کی تعمیر کے لیے انھوں نے تعلیم، ادب اور تمدن کی ترقی کو بھی ضروری قرار دیا۔ انھوں نے ابتدا ہی سے تعلیم کی طرف توجہ دی۔ خاص کر بچوں کی تعلیم کو لازمی قرار دیا، کیوں کہ بغیر تعلیم کے قوم کا مستقبل نہیں سنور

سکتا۔ انھوں نے آزادی کے بعد مولانا ابوالکلام آزاد کے ساتھ مل کر یونیورسٹی گرانٹ کمیشن کی بنیاد رکھی۔ تعلیم نسواں پر انھوں نے خصوصی توجہ دی۔ تکنیکی تعلیم کو انھوں نے اپنے تعمیری مشن میں بنیادی اہمیت دی۔ چنانچہ ہندوستان کے گوشے گوشے میں زراعتی اور تکنیکی ادارے قائم کیے گئے۔ دوسرے ملکوں کے ساتھ معاہدہ کر کے انھوں نے ہندوستانی طلبہ کو اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے مغربی ممالک میں جانے کے زیادہ سے زیادہ مواقع فراہم کرائے تاکہ نئے ہندوستان کی تعمیر میں وہ معاون ہو سکیں۔

نہرو جی یہ بات اچھی طرح جانتے تھے کہ سماجی تبدیلی کے بغیر صحیح معنوں میں ملک کی ترقی ناممکن ہے۔ لہٰذا انھوں نے پسماندہ طبقوں، قبائلیوں اور اقلیتوں کی ترقی پر خاص توجہ دی۔ جواہر لال نہرو نے کسانوں کی بھلائی اور دیہاتوں کی ترقی پر خاص زور دیا۔ آزاد ہندوستان میں جاگیرداری اور زمینداری نظام کو ختم کر کے کسانوں اور مزدوروں کو زمینداروں کے استحصال سے آزاد کرایا۔ دیہاتوں کی ترقی کے لیے Community Development پروجیکٹ شروع کیے۔ گاؤں گاؤں میں بجلی پہنچانے کے لیے مختلف اسکیمیں بنائی گئیں۔ دریاؤں پر بڑے بڑے باندھ بنا کر نہ صرف سینچائی کا انتظام کیا گیا بلکہ بجلی کی پیداوار میں بھی اضافہ کیا گیا۔ لیکن ان تمام منصوبوں کی کامیابی کا دارومدار نوجوان نسل پر تھا۔ اسی لیے پنڈت نہرو کا کہنا تھا کہ ''جس دن قوم کے بچوں کے اندر بیداری آ جائے گی اس دن قوم کو کوئی بھی طاقت پیچھے نہیں لے جا سکتی ہے۔'' پنڈت نہرو کے اندر قوم کا جو درد تھا اور قوم کے نونہالان کے ساتھ ان کی جو ہمدردی تھی، وہ مثالی بھی ہے اور ان کی عظمت کی نشانی بھی۔

جواہر لال نہرو بچوں سے بات کرنے اور ان کے ساتھ کھیلنے میں بہت دلچسپی لیتے تھے۔ بہت زیادہ مصروف ہونے پر بھی وہ بچوں کے جلسے جلوسوں میں شرکت کرنے کے لیے وقت نکال ہی لیا کرتے تھے۔ اپنی پیدائش کے دن وہ ایک بڑے ہال میں ہزاروں بچوں سے ملتے تھے۔ بڑھتی عمر کے ساتھ بچوں سے ان کا پیار بڑھتا گیا۔ اس لیے انھوں نے ہندوستانی بچوں کے نام اپنے ایک خط میں لکھا ہے:

''اگر تم میرے ساتھ ہوتے تو میں تم سے اسی خوبصورت دنیا کے بارے میں باتیں کرنا پسند کرتا۔ میں تم سے پھولوں اور پریوں، پرندوں اور جانداروں، ستاروں اور پہاڑوں، ہمالہ سے نکلنے والی ندیوں اور ایسی دوسری انوکھی چیزوں کے بارے میں باتیں کرتا جو ہمارے اردگرد ہیں، ہمیں گھیرے ہوئے ہیں تم نے بہت سی پریوں کے قصے اور پرانے زمانے کی کہانیاں پڑھی ہوں گی۔ لیکن آج تک جتنی بھی پریوں کے قصے یا بہادری کی کہانیاں لکھی گئی ہیں ان سب سے زیادہ دلچسپ اور بڑی کہانی خود دنیا ہے۔ ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ اسے پڑھنے کے لیے آنکھیں، سننے کے لیے کان اور ایک ایسا دماغ چاہیے جو زندگی اور دنیا کی خوبصورتی کو بے روک ٹوک اپنے آپ میں سمیٹنے کے لیے تیار ہو۔''

ہندوستان کی یہ پُروقار شخصیت، انسانیت اور امن کا عظیم علمبردار 27 مئی 1964 کو اس دارفانی سے رخصت ہو گیا، لیکن رہتی دنیا تک قوم کے اس عظیم سپوت کو لوگ یاد کرتے رہیں گے۔ آیئے ہم سب مل کر ''یوم اطفال'' کے اس موقع پر اپنے اندر عزم و عمل اور قربانی و محبت کا جذبہ پیدا کرنے کا عہد کریں۔

□□□

رابطہ:
K-78/A, 1st Floor
Batla House, Okhla
New Delhi-110025.

تیز تر اور دور تر (نقل و حمل کی کہانی)

مصنف: میر نجابت علی/ مترجم: مہ جبیں اختر

نقل و حمل انسان کی بنیادی ضرورت ہے۔ پیٹ بھرنے سے لے کر مختلف افراد سے ملنے اور دیگر ضروریات کے تحت ایک جگہ سے دوسری جگہ جانا انسان کا شوق بھی ہے اور مجبوری بھی۔ زیر نظر کتاب میں ذرائع نقل و حمل کے مسلسل ارتقائی سفر سے واقف کرایا گیا ہے۔

صفحات: 82، قیمت: 28 روپئے

جنگلات کی کاشت

مصنف: ایس. کے. داس/ مترجم: مسرت جہاں

جنگل ہمارے لیے اتنے ہی ضروری ہیں جتنی ندیاں، پہاڑ اور دیگر قدرتی اشیا۔ یہ نہ صرف ماحولیاتی توازن برقرار رکھنے میں معاون ہیں بلکہ کئی اہم صنعتوں کا دارومدار بھی ان پر ہوتا ہے۔ اس کتاب میں مختلف جنگلی درختوں اور جنگل سے متعلق مختلف پہلوؤں سے واقف کرایا گیا ہے۔

صفحات: 95، قیمت: -/24 روپئے

نوٹ: طلبہ کے لیے 45% اور اساتذہ کے لیے 40% کی خصوصی رعایت۔ تاجرانِ کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر.کے. پورم، نئی دہلی-110066

قومی اردو کونسل کی اہم مطبوعات

قدیم ہندوستان کی ثقافت وتہذیب تاریخی پس منظر میں

مصنف: ڈی.ڈی.کوسمبی

مترجم: بالمکند عرش ملسیانی

ہندوستان کی تہذیب وثقافت دنیا کی چند قدیم تہذیبوں اور ثقافتوں میں سے ایک ہے۔ مشہور مورخ ڈی ڈی کوسمبی نے اس کتاب میں ہندوستانی تہذیب وثقافت کے سرچشموں کی نشاندہی کے علاوہ اس کی بالیدگی وترقی کا تحقیقی جائزہ پیش کیا ہے۔ ما قبل تاریخ عہد کی ثقافت، آریوں کی آمد اور مگدھ سلطنت کو خصوصیت سے موضوع بحث بنایا گیا ہے۔

صفحات:319، قیمت-/73روپے

شیر شاہ اور اس کا عہد

مصنف: کالکا رنجن قانون گو

مترجم: رام آشرے شرما

شیر شاہ دنیا کی ان بڑی ہستیوں میں سے ایک ہے جن کے ساتھ تاریخ نے انصاف نہیں کیا ہے۔ اس کی سب سے اہم وجہ غالباً یہ رہی کہ شیر شاہ کی وفات کے دس سال کے اندر اس کا خاندان حکومت سے محروم ہو گیا اور مواد اور مآخذ مغلوں کے ہاتھ میں آگئے جنھیں شیر شاہ سے کوئی ہمدردی نہ تھی۔ اس کتاب میں فارسی زبان کے جملہ دستیاب نسخوں اور دیگر ذرائع کی مدد سے حقائق تک پہنچنے کی کوشش کی گئی ہے

صفحات:704، قیمت-/135روپے

تاریخ جہانگیر

مصنف: ڈاکٹر بینی پرشاد

مترجم: رحم علی الہاشمی

مغلیہ سلطنت کے چوتھے فرماں روا جہانگیر کے بارے میں لکھی گئی زیادہ تر کتابوں میں مغربی مورخین کی آرا سے استفادہ کیا گیا ہے جن کی صحت پر شک کی کافی گنجائشیں ہیں۔ اس کتاب میں پہلی مرتبہ توزک جہانگیری، اقبال نامہ اور دیگر فارسی تاریخوں، معاصر یوروپیوں کے سفر ناموں اور خطوط کی مدد سے جہانگیر کے عہد حکومت کے تمام اہم سیاسی اور فوجی کارناموں کا احاطہ کیا گیا ہے۔

صفحات:365، قیمت-/90روپے

تاریخ شاہجہاں

مصنف: ڈاکٹر بناری پرشاد سکسینہ

مترجم: ڈاکٹر سید اعجاز حسین

شاہجہاں کا عہد حکومت ہندوستانی تاریخ کا ایک زریں باب سمجھا جاتا ہے۔ اس عہد میں ہر طرف امن چین اور خوش حالی تھی اور ہر طرف علم وہنر کی ترقی نظر آتی تھی۔ اسی عہد میں تاج محل، لال قلعہ اور جامع مسجد جیسے ہند مغل فن تعمیر کے بہترین نمونے بھی وجود میں آئے اور بڑے بڑے جنگی معرکے بھی سر ہوئے لیکن اسی عہد میں عظیم مغلیہ سلطنت کے زوال کے آثار بھی نمودار ہونا شروع ہو گئے تھے۔ ڈاکٹر بناری پرشاد سکسینہ نے ان تمام حقائق کا معروضی جائزہ پیش کیا ہے۔

صفحات:466، قیمت-/109روپے

جنوبی ہند کی تاریخ

مصنف: کے.اے نیل کنٹھ شاستری

مترجم: آر.کے بھٹناگر

اس کتاب میں جنوبی ہندوستان کی قدیم تاریخ سے سترھویں صدی کے نصف تک کی مدت کا جائزہ پیش کیا گیا ہے جس میں جنوبی ہند کے جغرافیائی حالات، آریوں کا عروج، موریہ سلطنت، ستواہن، بہمنی اور دیگر سلطنتیں اور اس کا ادب، آرٹ، مذہب اور فلسفہ وغیرہ زیر بحث آئے ہیں۔

صفحات:576، قیمت-/114روپے

علی وردی اور اس کا عہد

مصنف: کالی کنکر دتا

مترجم: عبدالاحد خاں خلیل

جب مغلیہ سلطنت کی بنیادیں کمزور ہو گئیں تو ملک کے مختلف خطوں میں خود مختار حکومتیں وجود میں آنے لگیں۔ بنگال میں علی وردی خاں نے 1740 میں اپنی حکومت قائم کی۔ اس کتاب میں علی وردی کے حالات زندگی، بنگال، بہار اور اڑیسہ پر اس کا قبضہ، مرہٹوں کے حملے، افغانوں کی بغاوت اور دیگر اہم واقعات کے ساتھ ساتھ اس عہد کی معاشی، معاشرتی اور سیاسی صورت حال پر بنیادی مآخذ کی مدد سے روشنی ڈالی گئی ہے۔

صفحات:392، قیمت-/86روپے

انقلاب 1857

مرتب: پی.سی.جوشی

انقلاب 1857 ہندوستانی تاریخ کا ایک ایسا غیر معمولی واقعہ ہے جس کے ملک اور قوم پر دوررس اثرات مرتسم ہوئے۔ یہ انگریزوں کی غلامی سے نجات پانے کے لیے پہلی قومی بغاوت تھی جس نے ملکی سطح پر یکجہتی کے جذبات کو ابھارا۔ اس کتاب میں مختلف شعبۂ حیات پر اس کے اثرات پر ہندوستانی مورخین اور ادیبوں کے علاوہ غیر ملکی قلم کاروں کے بھی چند مقالات شامل کیے گئے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ اس انقلاب کا بین الاقوامی سطح پر بھی غیر معمولی نوٹس لیا گیا۔

صفحات:359، قیمت-/75روپے

انقلاب فرانس

مصنف: جے.ایم.تھامپسن

مترجم: بی.جے.سنگھ

1789 کا انقلاب فرانس تاریخ عالم کا ایک ناقابل فراموش واقعہ ہے جس نے تاریخ کے دھارے کا رخ موڑ دیا۔ آنے والے دنوں میں اس نے دنیا کی دیگر اقوام کو ظلم اور استحصال کے خلاف آواز بلند کرنے اور ظالم حکومتوں کا تختہ پلٹ دینے کا عزم وحوصلہ عطا کیا۔ اس کتاب میں اس عظیم انقلاب اور اس کے اثرات پر تفصیلی روشنی ڈالی گئی ہے۔

صفحات:758، قیمت:-/140روپے

RNI No. 70323/99
DL-SW-15/4104/2006-08
Date of Publication : 24/10/2006

URDU DUNIYA Monthly, November 2006, Vol. 8, Issue: 11
National Council for Promotion of Urdu Language
Department of Secondary & Higher Education, Ministry of H.R.D., Government of India

قومی اردو کونسل کی اہم مطبوعات

جامع التذکرہ (جلد اوّل)

مؤلف: پروفیسر محمد انصاراللہ

شعرائے اردو کے تذکرے نہ صرف شعرا کے احوال وکوائف سے متعارف کراتے ہیں بلکہ ان میں شامل انتخاب کلام سے ان شعرا کی درجہ بندی اور ان کی ادبی قدر وقیمت پر واضح روشنی پڑتی ہے۔ یہ تذکرے اردو تنقید کا اولیں نقش بھی ہیں۔ پروفیسر محمد انصاراللہ نے بڑی محنت سے اردو اور فارسی تذکروں میں شامل مختلف شعرا سے متعلق مواد کو حروف تہجی کے اعتبار سے یکجا کر دیا ہے۔

صفحات: 384، قیمت -/140 روپے

بحر الفصاحت (دو جلدوں میں)

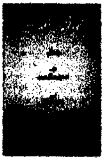

مصنف: حکیم نجم الغنی خاں نجمی رام پوری

تدوین: ڈاکٹر کمال احمد صدیقی

''بحر الفصاحت'' نظم ونثر کے محاسن اور معائب پر ایک اہم کتاب ہے جو اپنے موضوع پر استناد کا درجہ رکھتی ہے۔ یہ کتاب پہلی بار 1885 میں رام پور کے مطبع سرور قیصری سے اور دوسری اور تیسری بار مطبع منشی نولکشور، لکھنؤ سے بالترتیب 1917 اور 1926 میں شائع ہوئی۔ یہ ایڈیشن 1926 کے ایڈیشن پر مبنی ہے۔

صفحات: 1621، قیمت -/730 روپے

پریم چند کا تنقیدی مطالعہ

مصنف: ڈاکٹر قمر رئیس

پریم چند اردو کے ایک بڑے ناول نگار ہیں۔ اس کتاب میں پروفیسر قمر رئیس نے ان کی زندگی، ان کے تصور حیات، ان کے عہد اور ان کی تخلیقات کا مطالعہ اس خوش اسلوبی سے کیا ہے کہ یہ کتاب حوالے کی حیثیت اختیار کر گئی ہے۔ پہلی بار یہ کتاب دسمبر 1959 میں شائع ہوئی تھی۔ قومی اردو کونسل نے اس کا تازہ ایڈیشن شائع کیا ہے۔

صفحات: 424، قیمت -/152 روپے

کلیات سعادت حسن منٹو (پہلی جلد)

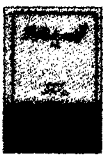

مرتب: پروفیسر شمس الحق عثمانی

سعادت حسن منٹو بیسویں صدی کے سب سے زیادہ پڑھے جانے والے اردو ادیبوں میں سے ہیں۔ کونسل نے ایک بڑے منصوبے کے تحت ان کی تمام تحریریں جن میں افسانے، ریڈیو ڈرامے، فیچر، مضامین، خاکے وغیرہ شامل ہیں، شائع کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ پہلی جلد میں ''آتش پارے''، ''منٹو کے افسانے'' اور ''دھواں'' کے افسانے شامل ہیں۔ ساتھ میں اشاریہ بھی دیا گیا ہے۔

صفحات: 565، قیمت -/285 روپے

کلیات علی سردار جعفری

مرتب: علی احمد فاطمی

قومی اردو کونسل نے قدیم اور جدید عہد کی اہم اردو تصانیف کو زمانے کی دستبرد سے محفوظ رکھنے اور اس تحقیقی علمی وادبی سرمائے کو موجودہ اور آنے والی نسلوں تک پہنچانے کے لیے ایک منصوبے کے تحت ان کی اشاعت کا سلسلہ شروع کیا ہے۔ کلیات علی سردار جعفری اسی سلسلے کی ایک اہم کڑی ہے۔ اس کی پہلی جلد میں ''پرواز''، ''نئی دنیا کو سلام''، ''خون کی لکیر'' اور ''امن کا ستارہ'' اور دوسری جلد میں ''ایشیا جاگ اٹھا''، ''پتھر کی دیوار''، ''ایک خواب اور''، ''پیراہن شرر''، ''لہو پکارتا ہے'' اور بعد کی چند نظمیں اور غزلیں شامل ہیں۔

جلد اوّل صفحات 496، قیمت 164 روپے
جلد دوم صفحات 533، قیمت 200 روپے

کلیات حسن نعیم

مرتب: احمد کفیل

نئی غزل کے پیش روؤں میں حسن نعیم کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ ان کی شاعری میں جو بانکپن نظر آتا ہے وہ اردو کی غزلیہ روایت میں انفرادیت کا حامل ہے۔ کلیات حسن نعیم میں ان کی تمام شعری تخلیقات تاریخی ترتیب سے جمع کر دی گئی ہیں۔

صفحات: 335، قیمت -/185 روپے

کوشش (منظر نامہ)

مصنف: گلزار

اردو زبان میں فلمی منظر نامہ ایک نئی صنف ادب ہے۔ اسے بصری پیکروں کا ایک ایسا سلسلہ کہا جا سکتا ہے جو کہانی کی شکل اختیار کرلے۔ فلم ''کوشش'' کا یہ منظر نامہ جاپانی فلم ''ہیپی نیس آف اس الون'' پر مبنی ہے جس میں ایک گونگے بہرے لڑکے اور ایک گونگی بہری لڑکی کی کہانی بیان کی گئی ہے۔

صفحات: 84، قیمت -/48 روپے

میرے اپنے (منظر نامہ)

مصنف: گلزار

قومی اردو کونسل نے فلمی منظر ناموں کی اشاعت خاص طور سے ان طلبہ اور طالبات کی رہنمائی کے لیے شروع کی ہے جو فلمی شعبے میں اپنا کیریر بنانے کے خواہش مند ہیں۔ منظر نامہ ''میرے اپنے'' مشہور فلم ساز تپن سنہا کی بنگالی فلم ''اپن جن'' کی کہانی پر مبنی ہے۔

صفحات: 139، قیمت: -/63 روپے

نوٹ -: طلبہ کے لیے 45 فیصد اور اساتذہ کے لیے 40 فیصد کی خصوصی رعایت۔ تاجرانِ کتب کو حسبِ ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

Printed and Published by Dr. R.K. Bhat, Principal Publication Officer, NCPUL on behalf of NCPUL and printed at S. Narayan & Sons, B-88, Okhla Indl. Area, Phase-II, New Delhi-110020 and published at NCPUL, West Block-1, Wing-6, R.K. Puram, New Delhi-110066, Editor : Dr. R.K. Bhat, Tel : 26103381, 26103938